Scanned with CamScanner

بسم اللہ الرحمن الرحیم
۴۲
واں
شمارہ
اللطیف ویلور
سالنامہ
۱۴۲۴ھ
2003ء
بیادگار:
شیخ المشائخ اعلیٰ حضرت مولانا مولوی ابو النصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر قادری رحمۃ اللہ علیہ
سجادہ نشین مکان حضرت قطبؒ ویلور
و
مولانا مولوی ابو صالح عماد الدین سید شاہ محمد ناصر قادری المعروف بہ میراں پاشاہ
رحمۃ اللہ علیہ
مدیرِ مؤسس:
حضرت اقدس مولانا ابو الحسن صدر الدین سید شاہ محمد طاہر قادری رحمۃ اللہ علیہ
تاریخ اجراء: ۱۱ر شعبان المعظم سنہ ۱۴۲۴ھ مطابق 8ر اکتوبر سنہ 2003ء بروز چہار شنبہ

زیرِ نگرانی :

مولانا مولوی ڈاکٹر ابو محمد سید شاہ محمد عثمان قادری ایم اے، پی ایچ ڈی، بی کام (عثمانیہ) ادیب فاضل
ناظم دار العلوم لطیفیہ، حضرت مکان، ویلور

مولانا سید شاہ ہلال احمد قادری شطاری ادیب فاضل (مدراس) نائب ناظم
دار العلوم لطیفیہ، حضرت مکان، ویلور

زیر ادارت :

مولانا مولوی پی۔ محمد ابوبکر ملیباری قادری لطیفی قمری مدرس دار العلوم لطیفیہ، حضرت مکان، ویلور

مولانا مولوی حافظ ڈاکٹر ابو النعمان بشیر الحق قریشی قادری لطیفی ایم اے، پی ایچ ڈی، استاذ دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان، ویلور

★

نمائندگانِ طلباء :

۱۔ مولوی سید خلیل احمد قادری	کرناٹکا
۲۔ مولوی ایم۔ اے۔ محمد حنیف	ویلور
۳۔ مولوی ایم۔ سید احمد	تنجاوُر
۴۔ مولوی ایم۔ شاہنواز	تنجاوُر
۵۔ حافظ محبوب باشاہ	آندھرا
۶۔ حافظ قلندر باشاہ	آندھرا
۷۔ مولوی جمال الدین	کرناٹکا
۸۔ مولوی عبد الغفور ٹی۔ ٹی	کیرلہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرستِ مضامینِ سالنامۂ اللطیف ۱۴۲۴ھ مطابق 2003ء

رُباعیاتِ امجد

امجد حیدرآبادی

میں کیا جانوں کہ کل کے دن کیا ہوگا!
لیکن جو کچھ بھی ہوگا اچھا ہوگا
کی جس نے یہاں پرورش آخر دم تک
واں بھی وہی کارساز اپنا ہوگا

خود اپنی نگاہوں سے گرا جاتا ہوں
قطرہ سا زمین میں سما جاتا ہوں
احباب مرے دفن کی کیوں فکر میں ہیں
میں شرمِ گناہ سے خود گڑا جاتا ہوں

بے خود میں رہوں تو وہ قریں آتا ہے
پردہ ہی میں وہ پردہ نشیں آتا ہے
وہ جب آتا ہے میں نہیں رہتا ہوں
میں جب رہتا ہوں وہ نہیں آتا ہے

وہ شاہوں کا شہ عزّوجل آئے گا
اب وقت نہیں ہے برمحل آئے گا
ضائع ہوگی نہ بُت پرستی میری
اس سنگ سے لعل بھی نکل آئے گا

رُباعیاتِ سرمد

شادی بود از دین و ز دُنیا ہمہ را
از ہر دو نجات دہ کہ شادیست مرا
آشفتۂ خود بکن کہ آنم ہوس است
از پردہ بروں آئی و خود را بنما

ترجمہ

ہے سب کی خوشی حصولِ دین و دُنیا
دونوں سے نجات دے یہ ارماں ہے مرا
اپنا ہی بنالے مجھے حسرت یہ ہے
پردہ سے نکل کر اپنا جلوہ دکھلا

مشہور شدی بدلربائی ہمہ جا
بیمثل شدی در آشنائی ہمہ جا
من عاشق ایں طور توام می بینم
خود را نہ نمائی و نمائی ہمہ جا

ترجمہ

مشہور ہے تیری دلربائی ہر جا
بیمثل ہے شانِ آشنائی ہر جا
عاشق میں ہوا ہوں اِس ادا پر تیری
ہے پردہ میں بھی جلوہ نمائی ہر جا

مناجات

قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین شیخ المشائخ حضرت مولانا رکن الدین سید شاہ ابوالحسن قربیؔ قادری علیہ الرحمہ

یا رسول اللہ یا ہادی الوریٰ ! — تو نچہ ہے شمس الضحیٰ بدر الدجیٰ

ذرّہ ذرّہ ہو کو توں ظاہر ہوا — اپنے پیدائی کو توں ساتر ہوا

حق کیا خورشید وحدت کا تجے — اس سورج کا ایک ذرّہ کر مجے

دل کو دے تیرے پرم کی چاشنی — پانوں تیرے ذات سوں نت روشنی

میں بی پیاسا ہوں مجے پانی پلا — چشمہ وحدت سوں اے بحر عطا

حق کوں حق سے دیکھے حق ہوں اچھیں — حق کو مطلق ویک مطلق ہوا چھیں

بندہ قربیؔ آستاں کا خاک ہے — نے نیر اکیا پاک و کیا ناپاک ہے

کر کرم سوں پاک اس ناپاک کو — عرش سوں برتر تو کر اس خاک کوں

یا رسول اللہ احوال تمام

تجہ پہ ظاہر ہے کہوں کیا والسلام

پیش کش : حضرت مولانا سید شاہ ہلال احمد صاحب قادری شطاری المعروف بہ ہلال پاشا۔ نائب ناظم دار العلوم لطیفیہ۔ ویلور
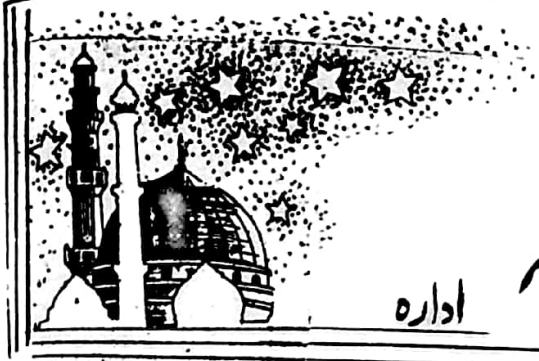
الفاظ کی دنیا بھی عجیب و غریب ہے۔ یہ بھی بڑے بڑے انقلابات اور تغیّرات سے دوچار رہتی ہے۔ لفظوں کے ساتھ بھی ولادت اور وفات کا سلسلہ رہتا ہے۔ اور ان کی زندگی بھی طویل یا مختصر ہوا کرتی ہے۔ بعض لفظ اپنے معنئ حقیقی کے ساتھ زندہ رہتے ہیں تو بعض اپنی حقیقی معنویت کھو دیتے ہیں اور بعض غیر معروف ہوجاتے ہیں، تو بعض کی معنوی وسعت ختم ہوجاتی ہے اور وہ محدود مفہوم اور کبھی غلط مفہوم لیے ہوے رہتے ہیں۔

اردو زبان میں ایک عام فہم مشہور لفظ سادہ لوح ہے۔ جو کسی شخص کی سادگی اور اس کے بھولے پن کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن یہی لفظ کسی شخص کے بے علم ہونے پر دلالت کررہا ہے۔ یعنی یہ وہ شخص ہے، جس کے لوح و ذہن پر کوئی حرف ثبت نہیں۔ اسی طرح لفظِ امام کی سرگزشت بھی عجیب و غریب اور عبرت خیز ہے۔ کبھی یہ لفظ متعدد معانی اور مطالب کا حامل رہا ہے۔ اور قوت و طاقت، غلبہ و اقتدار، علم و فن، زہد و تقوی کا عکس حسین اور مظہرِ جمیل رہا ہے۔ لیکن آج وہ اپنی تمام تر وسعتیں کھو چکا ہے۔ اور ایک محدود مفہوم میں مستعمل ہے۔

تاریخ اسلام کے ہر دور میں امام اور امامت کا لفظ بہت ہی معروف اور مشہور رہا ہے اور آج بھی وہ ایک معروف اور عام فہم لفظ ہے۔ لغت میں امام کا معنی ہے پیشوا، بادشاہ، ہادی، قائد، مقتدا اور امامت کا معنی ہے۔ پیشوائی اور رہنمائی اور یہ لفظ شریعت میں بھی مخصوص معانی اور مرادی مفاہیم رکھتا ہے۔

قرآنِ کریم میں امام کا لفظ متعدد مقامات پر آیا ہوا ہے اور مختلف معانی اور مفاہیم میں مستعمل ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے: یوم ندعو کل اناس بامامھم: ہم قیامت کے روز ہر جماعت کو اس کے امام سمیت بلائیں گے۔ سورۂ یٰسین میں ہے: وکل شیٔ احصیناہ فی امام مبین۔ بنی اسرائیل کی آیت میں امام سے مراد کیا ہے؟ اس میں مفسرین کی آراء اور اقوال مختلف ہیں۔ بعض کا کہنا ہے۔ اس جگہ امام سے مراد نبی کی ذات ہے۔ اور ہر اُمّت کو اس کے نبی کے حوالے سے پکارا جائے گا۔ یا اُمّۃ ابراھیم، یا اُمّۃ محمد اے ابراہیم کی اُمّت، اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت۔ بعض کا

خیال ہے کہ امام سے مراد آسمانی کتاب ہے جو انبیاء کرام کے ساتھ نازل ہوتی رہیں۔ اور ہر امت کو اس کتاب کے حوالہ سے پکارا جائے گا۔ یا اھل الانجیل، یا اھل القرآن: اے اہلِ انجیل، اے اہلِ قرآن۔ بعض کی رائے ہے کہ امام سے مراد نامۂ اعمال ہے۔ ہر شخص کو اس کے نامۂ اعمال کے ساتھ پکارا جائے گا۔ یا اصحاب کتاب الخیر، یا اصحاب کتاب الشر۔ اے نیکی کرنے والے لوگو، اے بدی کرنے والے لوگو! بعض کا قول ہے امام سے مراد مقتدا اور پیشوا ہے۔ ہر شخص کو اس کے پیشوا اور مقتدا کے نام سمیت پکارا جائے گا۔ فیقال یا اتباع فلاں: اے فلاں کے پیروکار اور متبع۔ مقتدا کا لفظ عام ہے۔ جو حضرات انبیاء اور ان کے نائب علماء و مشائخ کو شامل ہے۔ اور اس عموم میں وہ مقتدا اشخاص بھی شامل ہیں، جنھوں نے لوگوں کو کفر و معصیت کی جانب دعوت دی۔ جیسا کہ امام ابن کثیرؒ امام نسفیؒ وغیرہ نے لکھا ہے۔

مختلف اور متعدد احادیث میں بھی امام کا لفظ موجود ہے۔ جن میں امام کے نصب و تقرر اور اس کے قریشی ہونے کی شرط ہے اور اس کی طاعت اور پیروی کا حکم اور اس کے اوپر شرعی احکام کی تنفیذ اور حدود کے اجراء، جرائم کی روک تھام، فوجی تنظیم، زکوٰۃ و صدقات کی تحصیل، امر معروف اور نہی منکر کی ذمہ داری کے بارے میں تفصیلات ملتی ہیں۔ اور ان احادیث کی روشنی میں امام ایک با اختیار دینی و سیاسی شخصیت کا مالک نظر آتا ہے۔ اور وہ اپنی ذات سے ایک مستقل ادارہ کی حیثیت رکھتا ہے اور صحابۂ کرام کے ذہنوں میں امام کا لفظ اسی تصور کے ساتھ موجود رہا ہے۔ نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات شریف کے بعد آپؐ کے نائب کے لیے امام کی بجائے خلیفہ اور امیر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جو امام کا ہم معنی اور ہم پلّہ تھا۔

صحابۂ کرام خلیفہ کے تقرر کو ملّت اسلامی کے اہم ترین مسائل میں سے سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان بزرگوں نے نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تدفین کے ساتھ ہی خلیفہ کے انتخاب اور تقرّر کی جانب توجّہ کی۔ اس کے بعد ہر خلیفہ کی وفات کے بعد سب سے پہلا کام یہی کرتے تھے۔ اور کسی شخص کو خلیفہ مقرر کرتے تھے۔ کیوں کہ الشرع تحت السیف کے تحت بہت سے شرعی امور خلیفہ کی ذات سے جڑے ہوئے ہیں۔ اسی لیے علامہ تفتازانی اور دیگر علماء و فقہاء نے خلیفہ کے تقرر کو واجب کہا ہے۔ ان حضرات کا استدلال ہے کہ نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من لم یعرف امام زمانہ فقد مات میتۃ جاھلیۃ

جو شخص امام کے بغیر مرجائے تو اس کا خاتمہ صحیح نہ ہوا۔
بعض علماء نے اس حدیث کی تاویل یہ کی ہے کہ امام کا انتخاب اور تقرر واجب نہیں بلکہ اس کی معرفت واجب ہے۔ بشرطیکہ امام موجود ہو۔ بعض علماء نے اس حدیث میں لفظ امام سے نبی کی ذات مراد لیا ہے۔ بہر کیف اس حدیث میں توجیہات اور تاویلات کا سلسلہ طویل ہے۔
مذکورہ حدیث کی تشریح میں ملّا علی قاری کا مطمح نظر پوری طرح واضح دکھائی نہیں دیتا ہے لیکن اشارہ خلیفہ کے تقرر کو واجب بتلا رہا ہے۔ اس لیے کہ خلیفہ کی عدم معرفت ایک مذموم بات ہے اور جو بات مذموم سمجھی جائے اس کا ازالہ کرنا واجب ہے اور وہ ازالہ ہے خلیفہ کا تقرر۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنے میں سے کسی شخص کو خلیفہ بنائیں۔
علامہ تفتازانی، ملّا علی قاری اور دیگر جلیل القدر علماء و فقہا نے خلیفہ کے تقرر کو واجب قرار دیا ہے اور اس پر اجماع ہے اور عدمِ تقرر کو معصیت کہا ہے۔
لیکن اس مقام پہ ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ لزوم معصیت، قدرت کے ساتھ مشروط ہے۔ کیوں کہ عجز اور اضطرار کی حالت میں عدمِ تقرر کو معصیت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چناں چہ صحابۂ کرام، حضرات تابعین اور اہل بیت امام حسین رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کرنے میں عاجز اور مضطر تھے۔ انھوں نے بہت کچھ ہاتھ مارا یہاں تک کہ نوبت شہادت تک پہنچ گئی تو پھر کیسے یہ حضرات کرام عاصی اور گنہ گار ہو سکتے ہیں۔ جب کہ انھیں قدرت اور طاقت ہی نہ تھی۔
اس مقام پہ یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ قدرت اور طاقت رہنے کے علاوہ بھی کسی زمانہ میں خلیفہ کے انتخاب اور تقرر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جس شخص کو خلیفہ بنایا جارہا ہے اس کے اندر خلافت و امامت کی صفات بھی بدرجۂ اتم موجود رہنا چاہیے۔ خلفائے عباسیہ کے بعد کسی شخص کے اندر خلافت و امامت کی اہلیت و صلاحیت دیکھی نہیں گئی تو اہل علم اور خواص نے خلیفہ کے انتخاب اور تقرر کا التزام اور اہتمام نہیں کیا۔ ایسی حالت میں ان پر امت پہ تارکینِ واجب کا الزام کیسے عائد کیا جا سکتا ہے۔ ترک اور دیگر خلفاء کو سیاسی و مادی قوت حاصل رہنے کے باوجود ان کو وہ تقدس حاصل نہ ہو سکا جو خلافت و امامت کی صفات کی موجودگی کے باعث خلفائے راشدین وغیرہ کو حاصل تھا۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ امامت و خلافت کا تقدس ہی ختم ہو گیا اور خلیفہ کا نام صرف جمعہ اور عیدین کے خطبات میں لیا جانے لگا اور لفظ امام کی معنوی وسعت

اور اس کی ہمہ گیریت محدود ہوگئی۔

دورِ تابعین ہی سے امام کا استعمالی مفہوم یہ رہا کہ یہ لفظ اسلامی علوم وفنون میں ید طولیٰ رکھنے والے اصحاب کے لیے مختص ہوگیا اور کئی ایک فقہاء اور محدثین کو امام سے یاد کیا جانے لگا۔ لیکن فقہاء میں امام کا لفظ مخصوص معانی کے ساتھ جن حضرات کے اسمائے گرامی کا جزء قرار پایا وہ امام اعظم ابوحنیفۃ النعمان، امام مالک امام شافعی اور امام احمد بن حنبل ہیں۔ ان حضرات کی ذات سے ائمہ اربعہ کی اصطلاح رائج ہوئی اور چار فقہی مکاتیب وجود میں آگئے۔ اور امت کا سوادِ اعظم عہدِ تابعین سے لے کر عہدِ حاضر تک ان چار اماموں کی تقلید کرتے آرہا ہے۔ جس میں تابعین، تبع تابعین، سلف صالحین، علمائے حق، مشائخ، ائمہ طریقت اور صوفیاء سب جماعتیں شامل ہیں اور تقلید کا یہ عمل تواتر اور اجماع کا درجہ اختیار کرگیا ہے۔ اور ہر دور اور ہر زمانہ میں امت کی اکثریت کا یہ اجماع ایک دلیلِ شرعی اور حجت ہے اور یہ قرآن وحدیث کے بعد تیسری اصل ہے۔ اسی لیے علمائے حق نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ جو شخص قرآن وحدیث اور تفسیر وفقہ اور دیگر دینی علوم سے نابلد ہو وہ ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کی پیروی کرے اور اس کے لیے امام کا قول ہی حجت اور دلیل ہے۔ ایک عامی شخص کو امام کے قول پر عمل کرنے کا پابند کرنے میں مصلحت یہ تھی کہ ترکِ تقلید سے عوام ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے عقلاء اور حکماء بھی راہ ہدایت سے دور جا پڑے۔ چنانچہ امام غزالی نے ابونصر فارابی اور بوعلی سینا کی تکفیر کی جو حکمائے مشائین کے اکابرین میں سے تھے۔ کیوں کہ ان علماء اور حکماء کے نزدیک اللہ تعالیٰ کو جزئیات کا علم نہیں حشر اجساد نہیں اور عالم کا قدیم ہونا واجب ہے۔

اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ائمہ کی پیروی چھوڑ دینے کی وجہ سے اکابر عقلا اور حکمائے اسلام کا جب یہ حال ہوا تو سادہ لوح عوام کا حال کیا ہوسکتا ہے۔ مسلمانوں میں بہتر بدعتی فرقے اہل سنت کے ان چار اماموں کی پیروی چھوڑ دینے کے باعث گمراہی کے دلدل میں پھنس گئے اور اگر ہر عامی شخص قرآن وحدیث سے مسائل اخذ کرنے لگے اور اپنے غیر معتبر قیاس سے احکام استنباط کرنے لگے تو ہزاروں باطل مذاہب وجود میں آجائیں گے موجودہ زمانہ میں یہ خیالات اور شبہات پھیلائے جارہے ہیں کہ قرآن وحدیث کے ہوتے ہوئے ائمہ اربعہ کی پیروی کی کیا ضرورت ہے۔ اور قرآن میں ان کی پیروی کا حکم کہاں ہے؟ یہ قرآن وحدیث کے مقابلہ ائمہ کے مذاہب کو ترجیح دینا ہے اور یہ ایک اندھی تقلید ہے۔

اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں بے علم افراد کو اہلِ علم سے پوچھ کر احکام جاننے اور ان پر عمل کرنے

کی ہدایت دی گئی ہے۔ فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون: اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے امّت کو اپنے اصحاب کی اقتداء کا حکم دیا ہے اور بعض مخصوص صحابۂ کرامؓ میں موجود علم و فضل اور کمال کی نشان دہی فرمائی تاکہ عوام ان حضرات سے استفادہ کرے اور ان کی اقتداء کرے۔ اس موضوع کی وضاحت کے لیے یہ احادیث کافی ہیں:

- اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم: میرے صحابہ ستاروں جیسے ہیں۔ تم میں جو بھی ان کی اقتداکرے گا وہ ہدایت پائے گا۔
- مثل اصحابی فی امتی کالملح فی الطعام لایصلح الطعام الابالملح: میری امّت میں میرے صحابہ کی مثال نمک کی طرح ہے۔ جس طرح کھانے میں نمک ایک ضروری چیز ہے۔ اسی طرح دین کے معاملہ میں صحابہ کرام کی جانب رجوع کرنا ضروری ہے۔
- علیکم سنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین المھدئین: تمہارے لیے یہ ضروری ہے کہ میری سنّت کو اختیار کریں اور ہادیانِ حق خلفاے راشدین کی سنّت پر چلیں۔
- ترکت فیکم امرین ان اخذتم بھما لن تضلو اکتاب اللہ وعترتی: تمہارے درمیان دو چیز چھوڑے جارہاہوں۔ انھیں تھامے رہو تو ہرگز گمراہ نہ ہوں گے۔ اللہ کی کتاب اور میرے اہلِ بیت۔
- اقتدوا بالذین من بعدی من اصحابی ابی بکر و عمر واھتدوا بھدی عمار و تمسکوا بحدیث ابن ام عبد: میری وفات کے بعد ابوبکرؓ و عمرؓ کی اقتداء کرنا اور حضرت عمار کی ہدایتوں پر عمل کرنا اور ابن ام عبد یعنی عبداللہ ابن مسعودؓ کی حدیث کو مضبوطی سے پکڑنا۔
- اھتدوا بھدی عمار وما حدثکم ابن مسعور فصدقوہ: عمار کی ہدایات پر عمل کرنا اور ابن مسعودؓ جو حدیث بیان کریں اس کی تصدیق کرنا اور اس پر عمل کرنا۔
- اعلمھم بالحلال والحرام معاذ بن جبل وافرضھم زید بن الثابت و اقرؤھم ابی ابن کعب ولکل امۃ امین وامین ھذہ الامۃ ابوعبیدۃ بن الجراح: حلال اور حرام کا زیادہ علم رکھنے والے معاذ بن جبل ہیں۔ علم فرائض میں درک رکھنے والے زید بن ثابت ہیں اور قرآن کا گہرا علم رکھنے والے ابی ابن کعب ہیں۔ ہر امّت کے لیے ایک امین اور میری امّت کے لیے امین عبیدۃ بن الجراح ہیں۔

- قال لمعاویۃ اللّٰھم اجعلہ ھادیا مھدیا واھد بہ: اے اللہ! معاویہ کو ہادی بنا اوران کے ذریعہ امت کو ہدایت عطا فرما۔

نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو اس وقت ان سے پوچھا: اگر تمہیں کوئی حکم قرآن میں نہ مل سکا تو کیا کروگے؟ انھوں نے عرض کیا: حدیث میں تلاش کروں گا۔ پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: اگر تمہیں حدیث میں بھی نہ مل سکا تو کیا کروگے؟ انھوں نے جواب دیا قرآن وحدیث کی روشنی میں قیاس کروں گا۔

اسی حدیث سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن وحدیث سے احکام اخذ کرنے والا اور قیاس کرنے والا صاحب علم اور مجتہد ہونا ضروری ہے اور معاذ بن جبل کو بارگاہِ نبوت سے سند دی جاچکی ہے کہ وہ حلال وحرام کا زیادہ علم رکھتے ہیں۔ اعلمھم بالحلال والحرام۔

مذکورہ تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ اہلِ علم کی تقلید کوئی مذموم بات نہیں ہے۔ اگر ہر آدمی کے اندر یہ صلاحیت ہوتی کہ وہ قرآن وحدیث سے دلیل کو سمجھ سکتا تو پھر اہلِ ذکر سے پوچھنے اور مختلف صحابہ کرام کی جانب رجوع کرنے کا حکم کیوں دیا جاتا؟ تقلید تو اصولِ دین میں سے ایک اصل ہے اور قرآنِ کریم میں جہاں کہیں تقلید کی مذمت آئی ہوئی ہے اس کو ائمۂ اربعہ کی تقلید پر منطبق کرکے پیش کرنا ایک مغالطہ آمیز پہلو اور بے بنیاد موقف ہے۔ جس کی علمی اور تاریخی توجیہہ پیش نہیں کی جاسکتی۔ یہ مذمت اس اندھی تقلید کی کی گئی ہے، جو وحیٔ الٰہی کے مقابلہ میں کافر ومشرک آباء واجداد کی تقلید کی جارہی تھی۔ نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مکۂ مکرمہ کے باشندوں سے جب یہ کہا گیا کہ قرآن کریم کی اتباع کرو تو انھوں نے جواب یہ دیا کہ ہم اسی مذہب پر قائم رہیں گے جس پر ہمارے باپ دادا چلتے آئے ہیں۔ جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے: واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما وجدنا علیہ اٰبائنا اولو کانوا لا یعقلون۔

ہاں! اگر کوئی شخص قرآن وسنّت، صحابہ وتابعین، علمائے حق وسلف صالحین کے صریح اور واضح قول وفعل سے انحراف کرتے ہوئے کوئی عقیدہ اور عمل اختیار کرے اور یہ کہے کہ میں اسی پر قائم رہوں گا جس پر میرے آباء واجداد چلتے آئے ہیں، تو یہ اس شخص کی اندھی تقلید ہے۔ جیسا کہ بعض سادہ لوح عوام میں بعض غیر شرعی افعال واشغال اور رسومات وعادات سے متعلق ایسی بات دیکھنے کو ملتی ہے۔

شریعتِ مطہرہ میں اہلِ ایمان، صاحبانِ علم وفضل آبا و اجداد کی تقلید تو مطلوب اور محمود ہے اور ایسی تقلید میں دین کی حفاظت ہے۔ اور یہ چیز آنے والی اولاد کی جانب دین کو منتقل کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ اسلام کوئی ایسا نظریہ اور فلسفہ نہیں ہے جو صرف لٹریچر کے مطالعہ کی بنیاد پر اختیار کرلیا جائے۔ بلکہ یہ تو ایک ایسا عقیدہ اور عمل ہے جس کا تعلق صرف ذہن ہی سے نہیں بلکہ قلب سے بھی بڑا گہرا ہے۔ یہ دین تعلیم وتربیت اور اقتداء وتقلید کے ذریعہ نسلاً بعد نسلاً آج تک انسانوں میں منتقل ہوتے آرہا ہے۔ نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی تعلیم وتربیت فرمائی اور صحابہ نے اپنے بعد آنے والے لوگوں کی تعلیم وتربیت کی۔ خلف سلف کے مقلد بنتے چلے گئے اور ہم چنیں مسلسل کی روایت آج تک بھی برقرار ہے۔

قرآنِ کریم میں اللہ کے پیغمبر حضرت یعقوب علیہ السلام کی وفات کا پیش منظر ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے:

ام کنتم شھداء اذ حضر یعقوب الموت اذ قال لبنیه ما تعبدون من بعدی قالوا نعبد الھك واله اٰبائك ابراھیم واسمٰعیل واسحٰق الھا واحدا ونحن له مسلمون۔

مذکورہ آیت کا پس منظر یہ ہے کہ یہودیوں کی سرزنش اور ملامت کی جارہی ہے کہ تم جو یہ دعویٰ کرتے ہو کہ ابراھیم اور یعقوب علیہما السلام نے اپنی اولاد کو یہودیت کی پیروی کی وصیت کی تھی تو کیا تم وصیت کے وقت موجود تھے؟ اگر وہ یہ جواب دیتے کہ ہاں! ہم اس وقت موجود تھے تو یہ صریح جھوٹ ہوا۔ اور اگر یہ کہیں کہ حاضر نہیں تھے تو اُن کا مذکورہ دعویٰ غلط ثابت ہوگیا۔ کیوں کہ حضرت ابراھیم اور حضرت یعقوب علیہما السلام نے اپنی اولاد کو جو نصیحت کی تو وہ اسلام کی تھی نہ کہ یہودیت کی۔

حضرت یعقوبؑ کا جب آخری وقت آپہنچا تو انھوں نے اپنی اولاد کو اپنے پاس جمع کیا۔ کیوں کہ انہیں یہ فکر لاحق تھی، میرے انتقال کے بعد یہ لوگ کس مسلک اور کس طریقہ پہ گامزن رہیں گے، ان سے پوچھ لیں اور اطمینان کرلیں اور اگر کوئی اصلاح کی بات ہو تو وہ بھی درست کرلیں۔ اور ان کو صحیح راستہ پر چلنے کی وصیت کرلیں۔ چنان چہ آپؑ کے اہلِ بیت جمع ہوگئے تو آپؑ نے ان سے پوچھا: میرے بعد تم کس کی عبادت کروگے؟ تو سب نے جواب دیا: آپ کے معبود کی۔ اور آپ کے آباء و اجداد ابراھیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام اور اسحٰق علیہ السلام کے معبود کی۔ جو معبود ایک ہی ہے اور ہم سب اسی کے فرماں بردار رہیں گے۔

اور اسی جلیل القدر پیغمبر کے صاحب زادے خلف الرشید حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی اپنے

آباء واجداد کی تقلید کا اعتراف صاف لفظوں میں کیا۔ میں اپنے آباء واجداد حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کے دین کا پابند ہوں اور ہمیں ہرگز سزاوار نہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کریں۔ جیسا کہ سورہ یوسف میں ہے: واتبعت ملة اٰبائی ابراهیم واسحٰق ویعقوب ما کان لنا ان نشرك بالله من شئی۔

حضرت یوسف علیہ السلام خود کو اپنے آباء واجداد کا مقلد بتلاتے ہوئے یہ اظہار کر رہے ہیں کہ ہمارے لیے شرک سزاوار نہیں۔ اس بیان سے یہ اشارہ مل رہا ہے کہ تقلید صحیح سمت میں ہونی چاہیے اور غلط تقلید سے احتراز کرنا چاہیے۔

ائمہ اربعہ نے کسی نئے دین کی بنیاد نہیں رکھی۔ انھوں نے قرآن وحدیث اور صحابہ کے اعمال واقوال اور فتاویٰ کی روشنی میں مسائل کو حل کیا ہے اور جب کوئی حکم قرآن وحدیث اور صحابہ سے نہ مل سکا تو قیاس کیا اور امت کے لیے دین کو آسان بنا کر پیش کیا۔ امام ربانی نے اپنے مکتوبات میں لکھا ہے: کہ

احکام شرعیہ کے اثبات میں کتاب وسنت معتبر ہیں اور مجتہدوں کا قیاس اور امت کا اجماع بھی مثبت احکام ہیں۔ ان چار ادلہ شرعیہ کے علاوہ کوئی دلیل احکام شرعیہ کی مثبت نہیں ہے۔

اور مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے لکھا ہے: مجتہد وہ شخص ہے، جس میں پانچ قسم کا علم جمع ہو:

۱۔ کتاب اللہ کا علم۔ ۲۔ سنت کا علم ۔ ۳۔ علمائے سلف کے اقوال کا علم کہ کس بات میں ان سب نے اجماع کیا ہے اور کس بات میں اختلاف کیا۔ ۴۔ لغت کا علم۔ ۵۔ قیاس کا علم۔ اور قیاس اس کو کہتے ہیں کہ جس وقت کوئی حکم قرآن وحدیث اور اجماع میں نہ مل سکے تو اس حکم کو قرآن اور حدیث سے قیاس کر کے نکالا جائے۔ اور اس کام کے لیے ضروری ہے کہ علوم قرآن میں سے ان تیرہ[۱۳] باتوں کا علم ہو: ناسخ۔ منسوخ۔ مجمل مفسر۔ خاص۔ عام۔ محکم۔ متشابہ۔ کراہت۔ تحریم

جس طرح علوم قرآن میں مذکورہ امور کی معرفت ضروری ہے، اسی طرح حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی ان تیرہ چیزوں کا جاننا ضروری ہے۔ صحیح۔ ضعیف۔ سند اور مرسل کا جاننا۔ ترتیب قرآن کی حدیث پر اور ترتیب حدیث قرآن پر۔ یعنی دونوں کا رتبہ نگاہ میں رکھنا اور ان کے حکم کے مطابق اور تطبیق کرنا۔ جس میں ایسا نہ ہو کہ کوئی ایسی حدیث پائیں کہ وہ ظاہر میں قرآن کے خلاف ہو تو پھر محکم مجمل رہ جائے۔ اور حدیث نبوی صلعم تو ایسی

نہیں ہوتی بلکہ وہ تو قرآن کے معنی اور مضمون کی تفسیر ہوتی ہے۔

اور جن آیات واحادیث میں احکام شرع وارد ہیں ان کا جاننا بھی ضروری ہے۔

اور اسی طرح اس قدر علم لغت کا جاننا بھی ضروری ہے جس قدر لغتیں ان آیات واحادیث میں آئی ہیں۔ جن میں احکام ہیں۔ اور لغت میں اس قدر دخل ہونا چاہیے جس سے کلام عرب کے مطلب کو دریافت کر سکیں۔ اور مقام اور احوال کا اختلاف سمجھ سکیں۔ کیوں کہ اللہ اور اس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے عربی زبان میں حکم فرمایا ہے۔ لہذا جو کوئی عربی زبان سے ناواقف رہے گا وہ شریعت کے احکام سے ناواقف رہے گا۔

اور اس بات کا جاننا اور واقف ہونا ضروری ہے کہ صحابۂ کرام اور حضرات تابعین کے اقوال جو احکام شرع میں وارد ہیں اور فقہائے امت کے اقوال سے جو فتاوی صادر ہوئے ہیں۔ تاکہ اس شخص کا حکم ان حضرات کے قول کے مخالف نہ ہو۔ اور ان کے اقوال کی مخالفت کرنا گویا اجماع کی مخالفت کرنا ہے۔

جس شخص نے مذکورہ باتوں کو بخوبی جانا تو وہ مجتہد ہے اور جو شخص مذکورہ باتوں سے واقف نہیں ہے تو اس کو تقلید کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

اب رہ گئی ائمۂ اربعہ کے اختلاف کی بات جسے بعض لوگوں نے دین میں اختلاف سمجھ لیا ہے اور یہاں تک کہہ دیا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم تو ایک ہی شریعت لائے تھے پھر یہ چار مذہب (حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی) کہاں سے نکل آے۔

ائمۂ اربعہ کے درمیان جو اختلافات نظر آتے ہیں یہ بنیادی اور اصولی نوعیت کے نہیں ہیں بلکہ یہ فروعی اور جزوی اختلاف ہیں اور یہ اختلاف اہلِ اسلام اور اہلِ کتاب کی طرح نہیں ہیں یا سُنّی ورافضی یا سُنّی وخارجی کے اختلاف کی طرح نہیں ہیں بلکہ حق ان چار مذاہب میں داخل اور شامل ہے۔ اگر ان میں سے کسی کی دلیل زیادہ راجح ہو تو دوسرے کی دلیل کو گمراہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ ائمۂ مجتہدین کے اجتہاد، استنباط اور قیاس کے مختلف طریقوں کی وجہ سے اختلاف کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ اور یہ اس لیے ہوا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب صحابہ نے اپنے زمانہ میں مسائل کا حل تلاش کیا اور اجتہاد کیا تو ان کی آراء اور فتاویٰ میں اختلاف ہوا اور جب ائمہ نے فقہ کی تدوین کی تو اُن کے سامنے قرآن اور مختلف احادیث اور صحابہ کے مختلف اقوال اور فتاویٰ تھے۔ جس کی وجہ سے ائمہ کے ہاں اختلاف کا پیدا ہونا بھی ضروری تھا اور یہ اختلاف صرف احکام فقیہہ کے اندر ہے۔

عقائدِ دینیہ میں نہیں ہے۔ زمانۂ نبوت کے اجتہادات میں خطا اور صواب کا پہلو نہیں ہے بلکہ سراسر مفید یقین ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے مطابق عمل اور اعتقاد واجب ہوتا ہے اور وہ احکام جو زمانۂ نبوت کے بعد مجتہدوں کے اجتہاد سے حاصل کئے گئے ہیں وہ المجتهد يخطي ويصيب کے حکم کے مطابق خطا اور صواب کے درمیان ہیں، لہٰذا موجب ظن ہیں۔ موجب اعتقاد نہیں۔ اس کی وجہ سے ان کے مطابق عمل مفید ہے۔ مجتہد سے اگر خطا بھی ہو جائے تو اس کو ایک اجر ہے اور اس مجتہد کی تقلید اگرچہ کہ خطا ہو نجات کا باعث ہے۔ اس لیے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ان اخطاءت تلك حسنة: اجتہاد میں اگر تم سے خطا بھی ہو جائے تو ایک نیکی ہے اور اجر ہے۔ اور دوسری حدیث ہے مجتہد اجتہاد میں صحیح ہو تو اس کے لیے دو اجر ہیں اور اگر خطا ہو تو اس کے لیے بھی ایک اجر ہے۔

ائمۂ اربعہ میں امام اعظم ابو حنیفۃ النعمان نے کئی صحابۂ کرامؓ کو دیکھا اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے استفادہ کیا اور آپ صرف دو تین واسطوں سے فقیہہ امت حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں۔ چناں چہ آپ نے حضرت حماد سے اور حضرت حماد نے حضرت ابراہیم نخعیؒ سے اور حضرت ابراہیم نخعی نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فقہ سیکھی۔

محدثین کرام ائمۂ اربعہ کے بعد آتے ہیں۔ انھوں نے بھی ان حضرات کی پیروی کی اور یہ حضرات اپنی کتابوں میں احادیث نقل کرنے کے بعد صحابہ، تابعین اور ائمۂ اربعہ کے فتوؤں اور فیصلوں کو نقل کیا ہے۔ اگر یہ مسالک اور مذاہب بدعت اور گمراہی ہوتے تو یہ محدثین اپنی کتابوں میں ان اقوال کو کیوں نقل کرتے۔ حتیٰ کہ امام بخاری نے بھی اقوال نقل کئے ہیں۔

محدثینِ کرام میں امام ترمذی کا اسلوب نگارش منفرد نوعیت رکھتا ہے۔ آپ اپنی جامع اور سنن میں احادیث نقل کرنے کے بعد یہ بھی لکھتے ہیں: یہ وہ حدیث ہے، جس پر صحابہ نے فتویٰ اور فیصلہ صادر کیا اور اسی پر تابعین نے فتویٰ دیا اور اسی پر مختلف فقہاء اور اہلِ کوفہ نے فتویٰ دیا۔

غرض اس دورِ پرفتن میں ائمۂ اربعہ سے امت کی وابستگی کے باعث عقائد و اعمال میں انا کی اور خود سری کی فضا نہیں ہے۔ اگر یہ چار مذاہب سے لوگ آزاد ہو جائیں تو چالیس مذاہب پیدا ہو جائیں گے اور

عقائدِ دینیہ میں نہیں ہے۔ زمانۂ نبوت کے اجتہادات میں خطا اور صواب کا پہلو نہیں ہے بلکہ سراسر مفید یقین ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے مطابق عمل اور اعتقاد واجب ہوتا ہے اور وہ احکام جو زمانۂ نبوت کے بعد مجتہدوں کے اجتہاد سے حاصل کئے گئے ہیں وہ المجتہد یخطی ویصیب کے حکم کے مطابق خطا اور صواب کے درمیان ہیں، لہٰذا موجب ظن ہیں۔ موجب اعتقاد نہیں۔ اس کی وجہ سے ان کے مطابق عمل مفید ہے۔ مجتہد سے اگر خطا بھی ہو جائے تو اس کو ایک اجر ہے اور اس مجتہد کی تقلید اگرچہ کہ خطا ہو نجات کا باعث ہے۔ اس لیے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ان اخطاءت تلك حسنة : اجتہاد میں اگر تم سے خطا بھی ہو جائے تو ایک نیکی ہے اور اجر ہے۔ اور دوسری حدیث ہے مجتہد اجتہاد میں صحیح ہو تو اس کے لیے دو اجر ہیں اور اگر خطا ہو تو اس کے لیے بھی ایک اجر ہے۔

ائمۂ اربعہ میں امام اعظم ابو حنیفۃ النعمان نے کئی صحابۂ کرامؓ کو دیکھا اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے استفادہ کیا اور آپ صرف دو تین واسطوں سے فقیہہ امت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں۔ چناں چہ آپ نے حضرت حماد سے اور حضرت حماد نے حضرت ابراہیم نخعیؒ سے اور حضرت ابراہیم نخعی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فقہ سیکھی۔

محدثین کرام ائمۂ اربعہ کے بعد آتے ہیں۔ انھوں نے بھی ان حضرات کی پیروی کی اور یہ حضرات اپنی کتابوں میں احادیث نقل کرنے کے بعد صحابہ، تابعین اور ائمۂ اربعہ کے فتوؤں اور فیصلوں کو نقل کیا ہے۔ اگر یہ مسالک اور مذاہب بدعت اور گمراہی ہوتے تو یہ محدثین اپنی کتابوں میں ان اقوال کو کیوں نقل کرتے۔ حتّٰی کہ امام بخاری نے بھی اقوال نقل کئے ہیں۔

محدثینِ کرام میں امام ترمذی کا اسلوب نگارش منفرد نوعیت رکھتا ہے۔ آپ اپنی جامع اور سنن میں احادیث نقل کرنے کے بعد یہ بھی لکھتے ہیں: یہ وہ حدیث ہے، جس پر صحابہ نے فتویٰ اور فیصلہ صادر کیا اور اسی پر تابعین نے فتویٰ دیا اور اسی پر مختلف فقہا اور اہلِ کوفہ نے فتویٰ دیا۔

غرض اس دورِ پرفتن میں ائمۂ اربعہ سے امت کی وابستگی کے باعث عقائد و اعمال میں انا کی اور خودسری کی فضا نہیں ہے۔ اگر یہ چار مذاہب سے لوگ آزاد ہو جائیں تو چالیس مذاہب پیدا ہو جائیں گے اور

اس وقت فتنہ وفساد کا طوفان اُبل پڑے گا۔ جسے روکنے کی کسی میں ہمت نہ ہوگی اور یہ حقیقت ہے کہ عوام تقلید سے بے نیاز نہ ہو ہی نہیں سکتے۔ اور آخرکار وہ بے علم اور بے عمل افراد کی تقلید پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس سے تو بہتر یہی ہے کہ ائمہ اربعہ کی تقلید کی جائے۔ جن کی پیروی سلفِ صالحین، علمائے حق اور ہر دور کے علماء مشائخ اور امت کی اکثریت کرتے آرہی ہے۔

امام کا لفظ ائمہ اربعہ اور اصحاب علم وفن کے علاوہ اُن حضرات کے لیے بھی مستعمل ہے، جو فرض نمازوں کی امامت کے فرائض انجام دیتے آرہے ہیں۔ اور اس کا مفہوم موجودہ زمانہ میں فرائض پنجگانہ کی امامت تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اور امام کی امامت وقیادت کا اثر ونفوذ نماز سے خارج زندگی میں صرف چند مذہبی رسوم واعمال میں نظر آتا ہے اور اس کے علاوہ تعلیمی، صنعتی، تجارتی، سیاسی، معاشرتی اور سماجی میدان میں امام کی پیشوائی نہیں ہے۔ اس کا خاص سبب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس منصب پر وہ حضرات نہیں آرہے ہیں جو علم وفن اور فضل وکمال کے امام ہوں اور اس صورتِ حال کے پیدا ہونے کا سبب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس منصب کی قدر وقیمت باقی نہ رہی۔ اور اس عظیم دینی منصب کے لیے یہ معیار مقرر کر لیا گیا کہ کوئی بھی باریش اور غیر عالم شخص بے قاعدگی کے ساتھ سہی چند سورتوں کو خوش الحانی ہی سے پڑھ لے تو وہ اس مقام پر فائز ہو سکتا ہے۔ شاید اسی حالت کو سامنے رکھ کر علامہ اقبالؔ نے یہ بات کہی : ؎

قوم کیا ہے؟ قوموں کی امامت کیا ہے؟ کیا جانے یہ بیچارہ دو رکعت کا امام

حالاں کہ یہ وہ منصب ہے جس پر حضرت ابوبکرؓ کو فائز دیکھ کر حضرت علیؓ نے ان کے ہاتھوں پہ بیعت کر لی۔ اور اس وقت لوگوں سے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب بیمار ہوئے تو آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو نمازوں کی امامت کا حکم دیا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جس آدمی کو ہمارے دین کے لیے امام مقرر کیا تو ہم اپنی دنیا کے لیے ایسے آدمی کو کیوں نہ امام تسلیم کریں۔

موجودہ زمانہ میں امت کی اصلاح اور ترقی کے لیے کئی ایک کوششیں کی جارہی ہیں۔ اگر ایک کوشش منصب امامت کی جانب بھی کی جائے تو اس کے خاطر خواہ نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ سب سے پہلا اقدام یہ ہو کہ اس منصب کا وقار اور معیار بلند کیا جائے اور اس پر ایسے لائق اور فائق افراد کا انتخاب کیا جائے جو دینی علوم میں کمال وبصیرت کی سند رکھتے ہوں تو منبر ومحراب سے اٹھنے والی آواز ایک انقلاب لاسکتی ہے۔ اور ایسے ائمہ قرآن وسنت کی تعلیم اور اصلاح وتربیت اور دعوت وتبلیغ کا کام وسیع پیمانہ پر انجام دے سکتے ہیں۔ اور امت کی شیرازہ بندی کر سکتے ہیں۔

(بقیہ ص 50 پہ ملاحظہ ہو)

روئداد دارالعلوم لطیفیہ

ادارہ

دونوں جہاں میں یار و آباد تھے تو ہم تھے
تعمیر دو جہاں کی بنیاد تھے تو ہم تھے

جب تک کہ مسلمان حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے احکام کی تعمیل کرتے رہے اور ارشاداتِ عالیہ کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے رہے تب تک تو ہمارا بھی ستارۂ اقبال برجِ آسمانی پر درخشاں رہا۔

لیکن جب ہم نے احکام شریعت کو پس پشت ڈال دیا اور قرآنی تعلیم کو ترک کردیا اور رسول اللہ کی نافرمانیوں میں مشغول ہوگئے تو پھر اسی چاہِ ضلالت میں جا گرے کہ جس کے اندر سے آن حضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نور ہدایت بنا کر نکالا تھا۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں کے سامنے ہر ایک سر جھکا کر چلتا پھرتا تھا۔ آج حیوانات بھی نظرِ استحقار سے دیکھتے ہیں۔ وہ مسلمان جو غیروں کے لیے نور ہدایت تھا آج وہ خود گمراہ بن بیٹھے ہیں۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

آغازِ سال نو

اسلامی مہینوں کے لحاظ سے دارالعلوم لطیفیہ کا تعلیمی سالِ نو کا آغاز مورخہ ۱۰ر شوال المکرم ۱۴۲۳ھ ہجری مطابق ۱۴ر ماہِ ڈسمبر ۲۰۰۲ء کو ہوا۔

حسبِ عادت امسال بھی اکثر علاقوں سے آنے والے طلباء کا داخلہ ہوا۔

دورۂ حدیث کا آغاز

حسب سابق اس سال بھی دورۂ حدیث کے متعلق ایک تقریب مورخہ ۲۵ر شوال ۱۴۲۳ھ مطابق ۳۰ر ڈسمبر ۲۰۰۲ء بروز شنبہ صبح ٹھیک دس بجے، دارالعلوم لطیفیہ کے عریض ہال میں منعقد ہوی۔ جس کی صدارت ڈاکٹر مولانا ابو محمد سید شاہ محمد عثمان قادری، ناظم دارالعلوم لطیفیہ نے کی۔ جس میں صحیح البخاری اور صحیح المسلم کتبِ احادیث کا آغاز ہوا۔ ناظمِ موصوف کی دعاؤں کے ساتھ بحسن وخوبی انجام پذیر ہوا۔

افتتاحی اجلاس

مورخہ ۱۸ر ذی قعدہ ۱۴۲۳ھ مطابق ۲۲ر جنوری ۲۰۰۳ء بروز چہارشنبہ بعد نمازِ ظہر دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان، ویلور کے عریض وسیع ہال میں بزیرِ صدارت عالی جناب ڈاکٹر مولانا ابو محمد سید شاہ محمد عثمان قادری ناظم دارالعلوم لطیفیہ، مدرسہ کا افتتاحی اجلاس منعقد ہوا۔ قرأت قرآن پاک ونعتِ رسولؐ کے بعد مولوی سید محبوب پاشاہ عیدروس لطیفی صاحب نے مہمانِ خصوصی کا تعارف کیا۔ مہمانِ خصوصی جناب مولانا مولوی سید شاہ کمال اللہ ظہوری لطیفی چشتی القادری

گورنمنٹ سرقاضی چتور نے علم حاصل کرنے کے فوائد اور علم دین کی فضیلت پر روشنی ڈالی۔ جس سے اساتذہ کرام وطلباء دارالعلوم بہت محظوظ ہوئے۔

اسبابِ صحت

طلبائے عزیز اپنی صحتوں کو بحال رکھنے کے لیے ہر دن بعد نمازِ عصر دارالعلوم کے میدان میں مختلف گیمس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

نویدِ مسرت

الحمد للہ! اس سال بھی دارالعلوم لطیفیہ سے طلباء نے مدراس یونیورسٹی کے امتحانات افضل العلماء و ادیبِ فاضل میں شریک ہوئے اور شریک ہونے والے تمام طلباء نے شاندار کامیابی حاصل کی۔

امتحانات

مورخہ ۳۱ر مئی ۲۰۰۳ء سے جون کی پانچ تاریخ تک ششماہی امتحانات اساتذہ کرام کی نگرانی میں ہوئے۔ اور ۲۹ ر رجب المرجب ۱۴۲۴ھ مطابق ۲۶ر ستمبر سے دارالعلوم کے سالانہ امتحانات شروع ہوئے اور ایک ہفتہ تک جاری رہے۔

عباپوشی و اعطائے اسناد

حسبِ روایاتِ سابقہ اس سال بھی مولوی عالم اور شعبۂ حفظ سے فراغت پانے والے طلباء کو ناظم دارالعلوم حضرت ڈاکٹر مولانا ابو محمد سید شاہ محمد عثمان قادری صاحب مدظلہ العالی نے اپنے دستِ مبارک سے اسناد و عبا مرحمت فرمایا۔ یہ جلسہ نہایت تزک و احتشام کے ساتھ مورخہ ۱۱ر شعبان ۱۴۲۴ھ مطابق 8 ر ماہِ اکتوبر 2003ء روز چہارشنبہ صبح ٹھیک 10.30 بجے دارالعلوم کے وسیع و عریض ہال میں انعقاد پذیر ہوا۔

تقسیمِ انعامات

اسی دن شام میں ایک اور نشست ہوئی۔ جس میں درسیات اور مقالہ نویسی، تحریر اور تقریر اور گیمس و اسپورٹس میں اول و دوم آنے والے طلباء اور عہدیداروں کو ان کی خدمات کے صلہ میں قیمتی انعامات سے نوازا گیا۔

ھدیۂ تشکر

ادارہ ان تمام اطباء و ڈاکٹروں کا شکریہ ادا کرتا ہے جنہوں نے اساتذہ و طلباء کا علاج معالجہ کیا۔ ان مدیرانِ اخبار کا بھی شکریہ ادا کیا جاتا ہے جنہوں نے دارالعلوم کی کارگزاریوں کی خبریں شائع فرمائیں۔ بالخصوص جناب کاتب محمد شریف صاحب برکاتی آمبور اور عالی جناب سید علیم الدین علیم صبا نویدی صاحب کا بے حد ممنون و مشکور ہے جنہوں نے سالنامۂ اللطیف کی کتابت و طباعت کا کام بڑے خلوص و حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا۔

اللہ رب العزت ان سب کو جزائے خیر و سعادتِ دارین نصیب فرمائے۔ آمین ۞

مولوی حافظ ابوالنعمان بشیر الحق قریشی قادری لطیفی دام اقبالہٗ فاضل دارالعلوم لطیفیہ، استاذ تفسیر اور خلیفۂ اعلیٰحضرت مولانا مولوی ابوالنصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر قادری قدس سرہٗ کی ذات گرامی دینی اور علمی دنیا کے لیے محتاج تعارف نہیں آپ نے خانوادۂ حضرت قطب ویلور کے بزرگانِ محترم کے علمی و دینی اور ادبی کارناموں کو نہایت عمدگی اور سلیقہ مندی کے ساتھ نمایاں کیا ہے اور ان کی فارسی تصنیفات اور قلمی مخطوطات کو اردو قالب میں پیش کیا۔ فارسی سے بڑھتی ہوی لاعلمی اور ناآشنائی کے دور میں اس زمان میں موجودہ علمی و دینی اور نادر و نایاب ذخیرہ کو استفادہ کے قابل بنانا ایک عظیم اور مفید خدمت ہے۔ ربع صدی سے "سالنامۂ اللطیف" ویلور کی ادارت کے فرائض خالصۃً لوجہ اللہ انجام دیتے آرہے ہیں۔

آپ نے پروفیسر ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی، سابق صدر شعبۂ اردو، شری شنکر آچاریہ یونیورسٹی آف سنسکرت، کالڈی کیرلا کی سرپرستی اور پروفیسر ڈاکٹر صفیہ بی، صدر شعبۂ اردو، شری شنکر آچاریہ یونیورسٹی آف سنسکرت، کالڈی کی رہنمائی میں "حضرت قطب ویلور اور ان کے خلفا، کا علمی و ادبی کارنامہ" کے عنوان سے پی، ایچ ڈی، کے لیے مقالہ تحریر کیا۔ جس پر شری شنکر آچاریہ یونیورسٹی آف سنسکرت نے جولائی ۲۰۰۳ء میں آپ کو ڈگری آف ڈاکٹر آف فلاسفی تفویض کی ہے۔

اس علمی اعزاز کے خوش آفریں موقعہ پر حضرت مولانا ڈاکٹر سید شاہ عثمان قادری مدظلہٗ ناظمِ دارالعلوم لطیفیہ و سجادہ نشین خانقاہ حضرت قطب ویلور، حضرت مولانا سید شاہ ہلال احمد قادری شطاری مدظلہٗ نائب ناظم دارالعلوم لطیفیہ، اساتذۂ کرام، طلباے عزیز اور سالنامۂ اللطیف سے وابستہ حضرات مولانا مولوی پی۔ محمد ابوبکر ملیباری مدیر اللطیف جناب محمد شریف برکاتی کاتب اور جناب علیم صبا نویدی، پرنٹر کی جانب سے مولانائے موصوف کی خدمت میں نیک خواہشات اور ہدیۂ تبریک پیش ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مولانائے موصوف کے علمی و تحقیقی سفر کو ہمیشہ جاری رکھے اور آپ کی عمر و اقبال اور اہل و عیال اور اعمال میں خیر و برکت عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین صلے اللہ علیہ و آلہ و صحبہٖ اجمعین ۰

ادارہ

جواہر القرآن

مولانا مولوی حافظ ڈاکٹر بشیر الحق قریشی قادری لطیفی ایم اے، پی ایچ ڈی؛ استاذ دار العلوم لطیفیہ ویلور

سورۂ فرقان کے آخری رکوع میں اللہ تعالےٰ نے عباد الرحمان کے عنوان کے تحت بعض صفاتِ حسنہ اور اوصاف جمیلہ کا ذکر کیا ہے۔ اور ان کے ذریعہ اُمّتِ مسلمہ کو تعلیم اور ترغیب دی ہے کہ وہ ان صفات کو اپنے اندر کریں۔ اللہ نے ان صفات سے اپنی خوشنودی اور پسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے اور ان سے متصف افراد کو اپنے بندے قرار دے کر انھیں عزت اور سربلندی اور وقار بخشا ہے اور ان کو جنّت کی نعمتوں کے مستحق اور حق دار ٹھہرایا ہے۔ اس مقام پر انھیں صفاتِ حسنہ کا مختصر سا جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔ یہ ایسی صفات ہیں، جن کے وجود سے معاشرہ کے اندر امن وسکون، عزت و عافیت، خوش حالی وفارغ البالی، نیکی و پاکیزگی اور خیر خواہی وفیاضی قائم رہ سکتی ہے۔

اس رکوع کا آغاز اس طرح ہو رہا ہے: تبارك الذی جعل فی السمآء بروجا وجعل فیھا سراجا و قمرا منیرا وھو الذی جعل اللیل والنھار خلفة لمن اراد ان یذکر او اراد شکورا ہ

بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمان میں برج بنائے اور منزلیں قائم کیں اور اس میں آفتاب ضوفگن اور ماہتاب ضیاء پاش رکھا اور ان منزلوں میں چاند وسورج کی گردش قائم کردی اور اس سے کائنات میں کہیں اجالا اور کہیں اندھیرا ہونے لگا اور یہ تاریکی وروشنی ایک دوسرے کے پیچھے چلنے لگ گئی، سرد وگرم اور معتدل موسمیات اور بارشوں کا سلسلہ شروع ہوگیا غرض ساری دنیا کا ایک نظام وجود میں آگیا اور انسان کی زندگی کی بقا اور استمرار کے لیے ان گنت اشیاء کے وجود کا سلسلہ جاری کردیا اور یہ ساری چیزیں ایسی ہیں کہ اگر انسان ان میں غور وفکر کرے تو وہ اپنے خالق اور اپنے منعم کو بڑی آسانی کے ساتھ پہچان لے گا اور اللہ کی خلّاقیت اور اس کی ربوبیت کا احساس کرلے گا۔

اس رکوع کے اختتام پر جنّت اور جنّت کی نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس سے یہ حقیقت آشکار ہوجاتی ہے کہ انسان اپنے ایمان اور اپنے عملِ صالح کی بنیاد پر جنّت کا مستحق ہوگا۔

اس رکوع کے درمیان عبادالرحمٰن کا تعارف، ایمان اور اخلاق کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ وہ صفات ہیں جن کی آراستگی سے انسان دنیا اور آخرت میں فوز و فلاح سے سرفراز ہوگا۔

عبادالرحمان کی ترکیب سے یہ مفہوم واضح ہوجاتا ہے کہ ہر آدمی کو اللہ تعالےٰ کا بندہ بن کر زندگی گزارنی چاہیے عبد کی جمع عباد ہے۔ عبد کا معنی ہے بندہ، غلام، تابع دار، جو اپنی مرضی کو اپنے آقا کی مرضی میں گم کردے۔ بندۂ رحمان کا مطلب یہ ہوا کہ ایک مسلمان اللہ تعالےٰ کی مرضی کے مطابق اپنی زندگی بسر گزر کرے۔

رحمان کا لفظ صرف اس ذات کے لیے موزوں ہے جو ہر طرح کی نعمتوں کا خالق، مالک، قادر، متصرف اور وارث ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ شان صرف اللہ تعالےٰ ہی کی ہوسکتی ہے۔ اس کے سوا کسی انسان کے اندر یہ قدرت نہیں۔

وعبادالرحمٰن الذین یمشون فی الارض ھونا واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما۔

رحمٰن کے بندوں کی یہ صفت ہے کہ وہ زمین پر عاجزی وانکساری اور سکینت و وقار کے ساتھ چلتے ہیں۔ ان کی چال نہ تیز رفتار ہوتی ہے اور نہ سست رفتار بلکہ میانہ رو ہوتی ہے۔

قرآن کریم میں حضرت لقمان علیہ السلام کی وصیت بھی ہے، جو انھوں نے اپنے صاحب زادے کو کی تھی۔ واقصد فی مشیک تمہاری چال میانہ رو ہونی چاہیے۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے چلنے کا انداز حدیثوں میں ملتا ہے کہ آپؐ نہ تیز رفتار تھے اور نہ سست رفتار تھے۔ بلکہ چال مبارک میں اعتدال کی شان تھی۔ گردنِ مبارک ذرا سا جھکی ہوئی رہتی تھی۔ اور قدم مبارک کسی قدر تیزی کے ساتھ اٹھتے تھے گویا زمین آپؐ کے لیے سمٹتی ہے۔ کانما الارض تطوی لہ۔ دوسری حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی چال مبارک میں کسی قدر قوت ہوتی تھی گویا زمین کو کھود رہے ہے۔ کانما ینقلع۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی چال مبارک عاجزی وانکساری اور قوت و توانائی اور صحت و نشاط کی منہ بولتی تصویر تھی۔

آدمی کی چال اس کی شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ آدمی متواضع ہے یا متکبّر، کیف و نشاط سے سرشار ہے یا مرض و اضمحلال کا شکار، عجلت پسند ہے یا سست الوجود۔ اس کے بڑھتے ہوئے قدم سے بہت ساری باتیں آشکار ہوجاتی ہیں۔ اس لیے آدمی کو اپنی چال پر بھی توجّہ دینی چاہیے۔

میانہ روی صرف چال تک ہی مطلوب نہیں ہے بلکہ زندگی کے سارے امور و معاملات کے اندر مطلوب ہے

انسان کی چال کی طرح اس کا قال بھی اسکے مزاج اور نفسیات کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کی قوتِ گویائی سے اسکی خوش مزاجی اور اس کی بد خلقی پوری طرح نمایاں ہو کر رہتی ہے۔ بلکہ اس کے سارے عیب وہنر بھی سامنے آجاتے ہیں۔ سعدیؒ نے سچ کہا ہے:

تا مرد سخن نگفتہ باشد　　عیب وہنرش نہفتہ باشد

ہر شخص موافق حالات میں پوری شائستگی و خوش روئی اور خوش اخلاقی کے ساتھ گفتگو کرتا ہے لیکن ناموافق حالات اور ضرر رساں مواقع پر حلیم و بردبار شخص ہی، خوش گفتاری اور بلند کرداری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ چنانچہ عباد الرحمان کی یہ صفت ہے کہ وہ ناموافق حالات اور غیر شائستہ مقامات میں بھی خوش بیانی اور خوش اخلاقی کا پیکر بنے رہتے ہیں اور جاہلوں کو سلام کہہ کر کنارہ ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ خود بھی جاہل نہیں بنتے۔ چنانچہ ان کے اس وصف کا اظہار قرآن کی دوسری آیت میں اس طرح کیا گیا ہے: واذا سمعوا اللغو اعرضوا عنہ وقالوا لنا اعمالنا ولکم اعمالکم سلام علیکم لا نبتغی الجاھلین۔

جب وہ کوئی بے ہودہ بات سُن لیں تو یہ کہہ کر کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے ہیں۔ تم کو سلام۔ ہم جہلاء کا طریقہ نہیں اپنا سکتے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق ایک حکایت منقول ہے کہ ایک جاہل راہ گیر نے آپؑ کے ساتھ بدکلامی کی اور آپؑ نے خوش کلامی کا مظاہرہ کیا۔ کسی نے یہ دیکھ کر حضرت مسیحؑ سے کہا: آپؑ بھی اس کی سخت کلامی کا جواب سختی کے ساتھ کیوں نہیں دیتے تاکہ وہ خاموش ہو جاتا۔ فرمایا: اس کی بے ہودہ گوئی اور بدکلامی کی وجہ سے میں اپنا رویّہ نہیں بدل سکتا۔ کل اناء یترشح بما فیہ: پیالہ سے وہی چیز چھلکتی ہے جو اس میں رہتی ہے۔ مسیحؑ نے جس ہتھیار کو استعمال کیا وہی جہالت والوں کی جہالت اور سرکشی کو مار سکتا ہے۔

والذین یبیتون لربھم سجدا وقیاما

رحمان کے بندوں کی یہ بھی صفت ہے کہ وہ شب و روز کے فرائض پنجگانہ کے علاوہ بھی راتوں میں خصوصی عبادت و تلاوت اور دعا و استغفار کا اہتمام کرتے ہیں اور ان کے قلوب اللہ کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عتاب کے خوف کے ملے جلے جذبات سے لبریز رہا کرتے ہیں۔ جیسا کہ ایمان کا تقاضہ ہے۔ الایمان بین الخوف والرجاء اسی کیفیت کے باعث ان کے پہلو بستر پر نہیں لگتے۔ تتجافی جنوبھم عن المضاجع یدعون ربھم خوفا وطمعا۔

اوران کی یہ شان ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ اعمال پر مواظبت اور مداومت ہی اصل چیز ہوتی ہے۔ خواہ وہ اعمال چھوٹے ہی کیوں نہ ہوں۔ بعض اعمال وقتی طور پر انجام دینے کے بعد انھیں ایسا چھوڑ دیا جاتا ہے کہ پھر ان کو انجام دینے کی توفیق ہی نہیں ہوتی۔ اسی لیے عمل چھوٹا ہی کیوں نہ ہو اس کو ہمیشہ انجام دیتے رہنے میں خیر اور بھلائی ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے: خیر الامور ما یدیم علیہ، اعمال میں بہتر عمل تو وہی ہے جسے آدمی ہمیشہ کرتا رہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ آپؓ اپنی خلافت کے زمانہ میں دن بھر مصروف رہا کرتے تھے اور رات کا اکثر حصہ عبادت میں گزار دیتے تھے۔ کسی صحابی نے عرض کیا: امیر المؤمنین! آپؓ نے یہ کیا طریقہ اختیار کر رکھا ہے کہ نہ دن میں آرام کرتے ہیں اور نہ پوری رات سوجاتے ہیں۔ یہ سن کر حضرت علیؓ نے کہا عزیز من! اگر میں دن میں آرام کروں تو رعایا ضائع ہو جائے گی اور اگر پوری رات سوجاؤں تو کل قیامت کے روز میں ضائع ہو جاؤں گا۔

والذین یقولون ربنا اصرف عنا عذاب جھنم۔

بندگانِ رحمان کا یہ بھی وصف ہے کہ وہ اپنی عبادت اور ریاضت پر نازاں نہیں رہتے بلکہ اللہ کے عذاب سے لرزاں رہتے ہیں۔ اور دعائیں کرتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالے جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھے۔ جو بہت برا مستقر اور بہت بری جگہ ہے۔

والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذلک قواما۔

رحمان کے بندوں کا یہ بھی وصف ہے کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں نہ بخل سے کام لیتے ہیں۔ بلکہ خرچ میں توازن اور اعتدال برقرار رکھتے ہیں۔

قرآن نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے خطاب فرماتے ہوئے فرمایا: ولا تجعل یدك مغلولۃ الی عنقك ولا تبسطھا کل البسط فتقعد ملوما محسورا

آپؐ اپنا ہاتھ گردن سے نہ باندھ رکھیے اور نہ اسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دیں کہ ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔

نبی کریمؐ کو جو حکم دیا جارہا ہے دراصل آپؐ کے واسطہ سے امت کو تعلیم ہے کہ وہ اپنے اخراجات کے معاملہ میں میانہ روی اختیار کریں۔ اسراف اور فضول خرچی سے بھی باز آجائیں اور بخیل بن کر ایک ایک پائی جمع کرنے

ہیں لگ جائیں کہ کسی بھی کار خیر میں ہاتھ ہی نہیں کھل رہا ہے۔
ہاتھ کو کھلا چھوڑنے سے مراد یہ ہے کہ اسراف اور فضول خرچی نہ ہو اور ہاتھ باندھنے سے مراد یہ ہے کہ بخیل نہ بن جاؤ کہ چمڑی جائے دمڑی نہ جائے۔

روزگار و معیشت اور آمدنی کے باب میں اعتدال ہی صحیح موقف ہے۔ اسی سے معاشرہ میں خوشحالی و فارغ البالی اور فیاضی و سیر چشمی عام ہوجاتی ہے اور جس سماج میں اسراف و فضول خرچی عام ہوجائے وہ بہت جلد کھوکھلا اور کنگال ہوجاتا ہے اور جس سماج میں بخل کا مرض عام ہوجائے، وہ انسانیت کے احساسات اور جذبات سے عاری ہوجاتا ہے۔ اسی لیے اسلام نے بخل اور اسراف دونوں انتہاؤں کے بیچ میں اعتدال کی ہدایت دی ہے اور اسی روش کو سمجھ داری اور عقل مندی کی علامت قرار دیا ہے۔ من فقه الرجل قصده في معيشة سمجھ دار آدمی اپنی معیشت میں میانہ روی اختیار کرتا ہے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ بڑے فیاض اور سخی تھے۔ اپنی آمد کا بیشتر حصہ فقراء و مساکین میں تقسیم کردیا کرتے تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جانب سے ہمیشہ آپؓ کو خطیر اور کثیر رقم پہنچتی تھی اور آپؓ سب بانٹ دیتے تھے۔ جب یہ اطلاع حضرت معاویہؓ کو ملی تو انھوں نے خط لکھ بھیجا: لا خير في اسراف اسراف میں خیر نہیں ہے۔ حضرت حسینؓ نے جواب دیا: لا اسراف في خير: خیر میں اسراف نہیں۔

والذين لا يدعون مع الله الٰها اٰخر

بندگانِ رحمان کی صفت یہ بھی ہے کہ وہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر خواہ وہ کتنا ہی کٹھن اور ہلاکت خیز کیوں نہ ہو اللہ کے سوا کسی کو نہیں پکارتے اور اللہ تعالیٰ کی ذاتِ لامحدود اور اس کی صفاتِ بے نظیر اور اس کے افعالِ یکتا میں کسی کو شریک اور ساجھی نہیں ٹھہراتے اور وہ دل کی گہرائیوں سے یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حامی اور مددگار نہیں۔ لہذا عبادت بھی اسی کی اور استعانت بھی اسی سے۔ اياك نعبد واياك نستعين

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ان سے پوچھا گیا کہ سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ فرمایا: ان تجعل الله ندا وهو خلقك: اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا جب کہ اس نے تم کو پیدا کیا ہے۔ پھر اس کے بعد سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنے بچے کو اس خوف سے قتل کر ڈالے کہ وہ اس کے ساتھ کھائے گا: ان تقتل ولدك خشية ان يطعم معك: یعنی فقر و افلاس کے خوف سے اولاد کو قتل کیا جائے۔ پھر اس کے بعد

گناہِ کبیرہ یہ ہے کہ آدمی اپنے پڑوس کی بیوی کے ساتھ زنا کرے۔ ان تزانی حلیلۃ جارک: زنا ویسے بھی حرام ہے۔ لیکن مقام اور محل کی نزاکت اور اہمیت کے باعث اس کی حرمت میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک پڑوسی جو دوسرے پڑوسی پر مکمل اعتماد اور بھروسہ کرتا ہے جس کے ساتھ ہر زاویہ سے نیکی اور خیر خواہی ہونی چاہیے ایسی صورتِ حال میں پڑوسی کی بیوی کے ساتھ زنا کا جرم انتہائی سنگین اور ایک بڑے گناہ کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔

ولا یقتلون النفس التی حرم اللہ الا بالحق

رحمان کے بندوں کی یہ بھی صفت ہے کہ وہ قتل و غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم نہیں کرتے اور ناحق بے گناہ اور معصوم انسانوں کی جان نہیں لیتے۔ مگر اس وقت کسی شخص کی جان لیتے ہیں جب کہ وہ کسی انسان کو ناحق قتل کیا ہو اور یہ قتل، قتل نہیں بلکہ دوسرے انسانوں کے قتل کے انسداد کی کامیاب شکل ہے۔ قرآن کی زبان میں اس رویّہ اور طریقہ کو قصاص کہا گیا ہے۔ ومن قتل مظلوما فقد جعلنا لولیہ سلطانا: جو شخص مظلوم قتل کیا گیا ہو تو اس کے وارثوں کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ قاتل کو قتل کر دیں۔ شریعتِ مطہرہ نے خون کے بدلہ میں خون کے مسئلہ میں بڑی قیدیں قائم کر رکھی ہے تاکہ حق و انصاف کے نام پر اسی ظلم کو زندہ نہ کیا جائے۔ جس ظلم (قتل) کی روک تھام کے لیے قصاص کا قانون جاری کیا گیا۔ چناں چہ مقتول کے وارثوں پر یہ پابندی عائد کی گئی کہ وہ جوش و جذبہ اور انتقام سے مغلوب ہو کر قاتل کے ساتھ اس کے خاندان والوں کو بھی قتل نہ کر بیٹھیں یا قاتل کو ستا ستا کر اور تڑپا تڑپا کر اس کی جان نہ لیں۔

کوتاہ نظر اور ظاہر بیں افراد کے لیے قصاص ایک سخت گیر قانون نظر آتا ہے۔ لیکن اسی قانون کے اجرا اور نفاذ میں انسانوں کی جان کی سلامتی ہے۔ اگر قاتلوں کو قتل کی پاداش میں قتل نہ کیا جائے تو ظالم و سفاک افراد خون کی ہولی کھیلنے لگ جائیں گے۔ پھر کسی جان کی خیر نہ ہوگی۔ اسی سزا کے احساس اور یقین کے باعث قاتل خود بھی قتل کئے جانے کے خوف سے اور اپنی جان پیاری ہونے کی وجہ سے دوسروں کے قتل سے اپنا ہاتھ روک رکھے گا۔

قصاص کے مسئلہ میں دوسری صورت (دیت، خون بہا) بھی رکھی گئی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مقتول کے وارث قاتل کو قتل کرنے کی بجائے مال و زر لے کر اُسے چھوڑ دیں۔ کسی بھی معاشرہ میں انسان کی جان و مال اور عزت کی حفاظت ہی

اصل چیز ہوتی ہے ۔ جب یہ چیز خطرہ میں پڑ جاتی ہے تو انسانیت دم توڑ دیتی ہے ۔ اسی لیے اسلام نے لوگوں کی جان و مال اور عزت کی حفاظت پر بہت زور دیا۔ حتیٰ کہ بعض احادیث میں ایک مومن کی علامت ہی یہ قرار دی گئی کہ مومن تو وہ ہے جس سے لوگ اپنی جان و مال اور عزت کے بارے میں مطمئن ہو جائیں اور جس کی دست درازی سے لوگ محفوظ رہیں : المومن من امنه الناس علی دمائھم واموالھم، اموالکم واعراضکم حرام علیکم من سلم المسلمون من لسانه ویدیه۔

ولا یزنون

بندگانِ رحمان کی صفت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی جنسی خواہشات شرعی و قانونی عورت کے ساتھ پورا کرتے ہیں ۔ بے نکاح والی عورت کے ساتھ اس قسم کا تعلق پیدا نہیں کرتے ۔ اسلام نے اس قسم کے تعلق کو ناجائز اور حرام ٹھہرایا اور اس فعل کی سزا بھی بڑی عبرتناک تجویز کی ۔ تاکہ معاشرہ میں یہ فضا عام نہ ہو سکے ۔ چناں چہ اس فعل کے ارتکاب کرنے والے شخص کو زمین میں نصف حصّہ تک گاڑنے اور لوگ پتھر مار کر سنگ سار کرنے کا حکم دیا ۔ اس دنیاوی سزا کے بعد اخروی سزا کی یہ وعید سنائی کہ ایسے افراد کو جہنم کی اس وادی میں پھینک دیا جائے گا ۔ جس سے جہنم خود پناہ مانگتا ہے ۔ قرآن نے اس وادی کا نام اثاما بتلایا ہے ۔

والذین لا یشھدون الزور

صالح بندوں کی یہ بھی صفت ہے کہ وہ کسی جھوٹی بات یا کسی جھوٹے کام میں گواہ نہیں بنتے ۔ جھوٹ بات کہنا اور جھوٹی بات پر گواہ بننا دونوں کام حرام قرار دیے گئے ہیں ۔ جھوٹ سے کئی ایک برائیاں جنم لیتی ہیں اور آدمی جھوٹ سے دوسرا جھوٹ بولنے لگتا ہے اور شعوری اور غیر شعوری طور پر بے شمار گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔ نبیؐ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : جھوٹ آدمی کو گناہ کی طرف لے جاتا ہے اور گناہ ، دوزخ کی طرف لے جاتا ہے اور جب آدمی مسلسل جھوٹ بولنے لگتا ہے تو وہ اللہ تعالےٰ کے ہاں جھوٹا لکھا جاتا ہے اور سچ آدمی کو نیکی کی طرف لے جاتا ہے اور نیکی ، جنّت کی طرف لے جاتی ہے ۔

جھوٹ بات کہتے رہنے کا ایک بہت بڑا نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ جھوٹا شخص اپنے ہی دوستوں اور عزیزوں اور گھر والوں میں ناقابلِ اعتبار ٹھہر جاتا ہے ۔ پھر جب اس کے جھوٹ کی شہرت پھیل جاتی ہے تو سارے سماج کے اندر غیر معتبر اور غیر ثقہ بن جاتا ہے اور اس کی شخصیت بکھر کر رہ جاتی ہے اور وہ رحمتِ خداوندی سے محروم ہو جاتا ہے ۔ چنان چہ

قرآن کریم نے صراحت کی ہے۔ جھوٹ بولنے والوں پر خدا کی لعنت برستی ہے۔ لعنت اللہ علی الکذبین۔ لعنت اسلام کی لغت میں بہت ہی ناپسندیدہ اور مکروہ لفظ ہے اور اس کا مفہوم ہی ہے رحمت سے دُور ہو جانا اور کسی آدمی کے حق میں اس سے بڑھ کر اور کوئی آفت و مصیبت نہیں ہو سکتی کہ وہ اللہ کی رحمت سے بھی دُور اور بندوں کی عزت و محبت سے بھی محروم۔

نفاق ایک بدترین اور مغالطہ آمیز کردار ہے۔ اور صاحبِ نفاق کو منافق کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس کا قول اور عمل دو رُخ لیے ہوتا ہے۔ اس کا ظاہری پہلو ایک ہوتا ہے اور اس کا باطنی پہلو ایک ہوتا ہے۔ یقولون بالسنتھم مالیس فی قلوبھم ؛ وہ اپنی زبانوں سے جو کہتے ہیں وہ اُن کے دلوں میں نہیں ہوتا۔ منہ پر کچھ اور دل میں کچھ والا کردار نہ صرف ایک دھوکہ کی شکل ہے بلکہ وہ بھی ایک جھوٹ ہی کی قسم ہے۔ زبانِ نبوت نے اس طائفہ کی پہچان یہ بتلائی ہے کہ جب کہے تو جھوٹ بکے، وعدہ کرے تو پُورا نہ کرے۔ امین بنائے تو خیانت کر بیٹھے۔ بات کرے تو گالی دے۔

اذا حدث کذب واذا وعد اخلف واذا اوتمن خان واذا تکلم شجر:

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے۔ موجودہ زمانہ میں دروغ گوئی ایک محمود صفت بن گئی ہے اور یہ ہوشیاری اور چالاکی کی علامت قرار پائی ہے۔ اور لطف و مزاح اور تفنن طبع کی چیز بن چکی ہے۔

اسلامی قدریں بدل رہی ہیں۔ تحریم تحلیل کا روپ اختیار کر رہا ہے، طرفہ طرازی تو یہ ہے کہ حرام کا احساس اور اس پر گرفت کا خوف ختم ہوتا جا رہا ہے۔

جھوٹ کا ایک خطرناک پہلو یہ ہے کہ کسی جھوٹ کے سچ ہونے کی گواہی دے جائے اور اس کے سچ ہونے پر قسم کھائی جائے۔ تاکہ اس قسم کے ذریعہ اس جھوٹ کے سچ ہونے پر کسی طرح کا شک و شبہ باقی نہ رہے۔ قسم کھانا اور گواہی دینا کا معنی ہی یہ ہے کہ اس (جھوٹ) سچ پر خدا کو گواہ بنایا جائے اور اپنی بات میں تاکید و توثیق پیدا کی جائے اور یہ کتنا بڑا المیہ ہے اور خود کو کتنا بڑا دھوکا دینا ہے، جب کہ وہ اچھی طرح سے جانتا ہے کہ میں جو گواہی دے رہا ہوں وہ جھوٹی ہے۔ جامع الترمذی کی روایت ہے کہ نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہؓ سے فرمایا: کیا میں تمہیں یہ بتلادوں کہ گناہ کبیرہ کیا ہے؟ عرض کیا: ہاں! یارسول اللہ! ارشاد فرمایا: شرک اور والدین کی نافرمانی۔ راوی کا کہنا ہے کہ حضور اکرمؐ یہ بات کہتے وقت ٹیک لگا کر بیٹھے تھے۔ پھر آپ اٹھ بیٹھے اور فرمایا: اس کے

بعد سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی جھوٹ بات کہے اور جھوٹی گواہی دے۔ اسی بات کو آپؐ بار بار کہتے جا رہے تھے یہاں تک کہ ہم اپنے دلوں میں سوچنے لگے کہ کاش آپؐ خاموش ہو جاتے۔

واذا مروا باللغو مروا کراما

رحمان کے بندوں کی یہ بھی صفت ہے کہ جب ان کا گزر لغو چیز پر ہو جائے تو شرفا کی طرح گزر جاتے ہیں۔ لغو کے مفہوم میں لایعنی کام، لایعنی بات، فسق و فجور اور فضول چیزیں شامل ہیں۔ شرافتِ نفس اور نفاستِ طبع اور ایمان کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ آدمی لغویات سے اپنا دامن بچاتے ہوئے گزر جائے۔ سورۃ المؤمنون میں اہلِ ایمان کے کردار کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ وہ لغویات سے دور رہتے ہیں: والذین ھم عن اللغو معرضون۔

والذین اذا ذکروا بآیات ربھم لم یخروا علیھا صما وعمیانا

رحمان کے بندوں کی صفت یہ بھی ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو تذکیر و تعلیم کے خیال سے پڑھا جاتا ہے تو ان کی صالح فطرت اور سلامتیٔ قلب کے باعث ان پر آیات کے معانی اور مطالب منکشف ہو جاتے ہیں اور ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے اور ان کے اندر فرائض پر مواظبت کی شان پیدا ہو جاتی ہے اور منہیات اور ممنوعات سے مزید نفرت بڑھنے لگتی ہے۔

والذین یقولون ربنا ھب لنا من ازواجنا وذریتنا قرۃ اعین وجعلنا للمتقین اماما۔

بندگانِ رحمان کی یہ صفت بھی ہے کہ وہ بیوی اور بچوں کے تعلق سے بارگاہِ خداوندی میں عرض کرتے ہیں اے ہمارے رب! ہماری بیویوں اور ہمارے بچّوں اور بچیّوں کو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا۔

کسی شخص کو دُنیا میں ملنے والی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت نیک بیوی اور نیک اولاد ہے اور ان دو نعمتوں ہی میں دُنیاوی زندگی کا چین و سکون اور عزت و وقار اور خوشی و مسرت چھپی ہوئی ہے۔ کسی شخص کی اولاد بے علم و جاہل اور بد اخلاق و بدکردار ہو جائے تو یہ ایک ایسا عذاب ہے۔ جس سے بڑھ کر دُنیاوی عذاب کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ اور اسی طرح کسی شخص کو بے علم اور بدچلن بیوی مل جائے تو زندگی سوہانِ روح بن

جاتی ہے۔ اس کے برعکس تعلیم یافتہ نیک بیوی اور صالح اولاد دُنیا میں بھی راحت اور آخرت میں بھی ثواب اور درجات کی رفعت کا باعث ہوتے ہیں۔

نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ہیں :

- الدنیا کلھا متاع وخیر متاع الدنیا المرأۃ الصالحہ : دنیا کی بہترین متاع اور بہترین نعمت نیک کردار صالح بیوی ہے۔
- اذا مات الانسان انقطع عملہ الامن ثلث صدقۃ جاریۃ وعلم ینتفع بہ وولد صالح یدعولہ : آدمی مرجاتا ہے تو عمل کا سلسلہ بھی منقطع ہوجاتا ہے۔ لیکن تین چیزوں سے وہ بہرور ہوتا ہے۔ صدقۂ جاریہ (مثلاً مسجد، مدرسہ، مہمان خانہ، مسافر خانہ، غریبوں کے لیے مکانات، پانی کا انتظام، درخت لگانا، راستہ، پُل وغیرہ کی تعمیرات۔ غرض کہ ہر وہ کام جس سے اللہ کی مخلوق فائدہ اٹھاتی رہے۔ جس کی افادیت برقرار رہے) مفید اور فیض رساں علم (تعلیم کی اشاعت کی تمام صورتیں اور شکلیں) اور نیک اولاد جو اپنے ماں باپ کے حق میں دُعا کرتی رہے۔

قرآن کریم نے مال و دولت اور بیوی بچّوں کا ایک اور کردار بھی پیش کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ چیزیں انسان کے لیے ایک فتنہ اور آزمائش بھی ہیں۔ ان ہی کی محبت میں گرفتار ہو کر آدمی اپنی دنیا اور آخرت دونوں کو خراب کر لیتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں کہا گیا ہے : مبخلۃ مجبنۃ : آدمی اپنی بیوی اور بچّوں کی وجہ سے داد و دہش اور صدقات وخیرات اور صلۂ رحمی سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور ان کی وجہ سے اس کے اندر جرأت وہمت اور حق گوئی کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے اور اس کے اندر یہی بخیلی اور کمزوری مختلف کمزوریوں اور بُرائیوں کو پیدا کرتی ہے۔ اور اس کے حق میں نیکیوں کا دروازہ بند کر دیتی ہے اور آخرت میں اس کے سامنے یہ نتیجہ آتا ہے کہ اس کی بیوی اور بچّوں نے اس کی نیکیوں کو کھا لیا ہے۔ اولاد کی وجہ سے نہ صرف نیکیاں ختم ہوچکی ہیں، بلکہ ان ہی کی وجہ سے اس نے ہزاروں گناہوں کا ارتکاب کیا ہے : اکل عیالہ حسناتہ جیسا کہ نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اس شخص کی نیکیوں کو اس کے گھر والوں نے کھا لیا ہے۔

دُنیا اور آخرت میں بیوی بچّوں کی طرف سے سود اور زیاں کا مسئلہ بہت ہی اہم ہے۔ اسی لیے بیوی بچّوں کو نیک اور صالح بنانے کی سعی وعمل کے ساتھ ساتھ دعا کا بھی اہتمام کرنا چاہیے۔ کہ وہ.. (بقیہ صفحہ 46 پر ملاحظہ ہو۔)

جواہر الحدیث

مولوی حافظ ابوالنعمان بشیر الحق قریشی قادری استاذ دار العلوم لطیفیہ۔ ویلور

ذیل میں ایک حدیث کی تشریح کی جارہی ہے جس میں نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک صحابی حضرت ابوذر غفّاری رضی اللہ عنہ کو سات وصیتیں اور نصیحتیں فرمائی ہیں۔ یہ حدیث مخاطب کے لحاظ سے تو خاص ہے۔ لیکن حکم کے اعتبار سے عام ہے جس میں ساری امّت شامل ہے۔۔
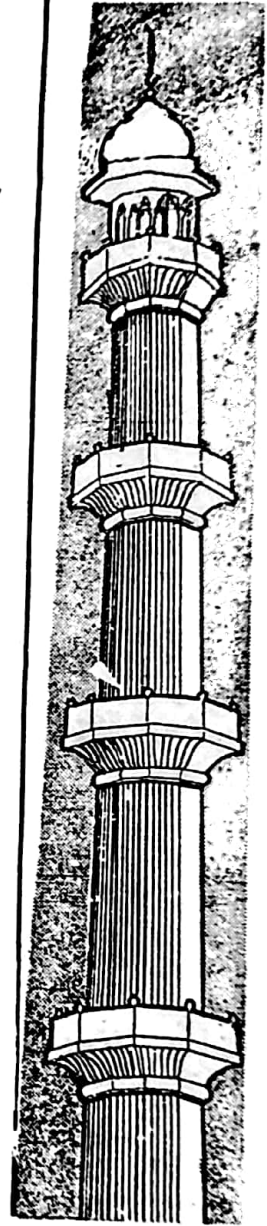
احادیثِ نبویؐ کے کئی پہلو کئی جہت اور کئی سمتیں ہیں، جن کے اندر علوم و معارف، حقائق و دقائق، معانی و مطالب، اطلاعات و نشانیات، پند و نصائح، احکام و مسائل اور انکشافات و پیش گوئیوں کی ایک دنیا موجود ہے اور یہ لسانِ نبوتؐ کا اعجاز ہے۔ نبیؐ کریمؐ نے اپنے اصحاب میں سے بعض حضرات کو خاص خاص باتوں کی تعلیم دی اور مخصوص نصیحتیں کیں اور ان کے ساتھ لطف و مزاح کی باتیں کیں اور بعض کے سامنے اسرار و رموز کی باتیں کیں۔ اور تنبیہات و تاکیدات فرمائیں۔ اس طرح سے احادیث کے اندر اسالیبِ بیان کا ایک جہان آباد ہے۔ اس مقام پر حضرت ابوذرؓ غفاری کی ایک حدیث پیشِ نظر ہے۔ جس کے اندر مفید نصیحتیں ہیں۔

حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں اوصانی خلیلی بسبع : میرے حبیب صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے سات وصیتیں فرمائی۔

● ۱۔ امرنی بحب المساکین والدنو منھم

میرے حبیب صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ میں مسکینوں سے محبت کروں اوران کے ساتھ ربط وضبط رکھوں۔ مساکین مسکین کی جمع ہے اور مسکین اس شخص کو کہتے ہیں جو ایک عام حاجت مند شخص کے مقابلہ میں زیادہ خستہ حال ہو اور وہ اپنی حاجت بھر مال نہ پاتا ہو۔ اور اس کی ظاہری حالت سے بھی اس کی خستہ حالی کا پتہ نہیں چلتا اور یہ بھی لوگوں کے سامنے اپنی ضرورت وحاجت کو بیان نہیں کرتا اور نہ ہی کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے

المسکین الذی لا یجد غنی یغنیه ولا یفطن له فلیتصدق علیه ولا یقوم فیسأل الناس

مسکین کی طرح ایک اور لفظ ہے فقیر جس کی جمع فقراء آتی ہے یہ دونوں لفظ قرآن وحدیث میں متعدد مقامات پہ ملتے ہیں۔ فقیر کا لفظ بھی مسکین کے مفہوم سے قریب ہے۔ فقیر اس شخص کو کہتے ہیں، جو اپنے روزگار کے لیے دوسروں کا محتاج ہو۔ اس تعریف میں ہر وہ شخص شامل ہے، جو کسی جسمانی نقص یا کسی حادثہ کی وجہ سے معذور یا کسی اور عارضہ کے باعث دوسروں کا محتاج بن جائے۔

بہر کیف ایسے خستہ حال وتنگ دست آدمی کو فقیر کا نام دیجیے یا مسکین لیکن ہیں یہ دونوں بھی اپنی ضرورت و حاجت میں دوسروں کی عنایت و توجہ اور تعاون کے مستحق اور یہ طبقہ تاریخ کے ہر دَور اور ہر ملک اور ہر قوم میں موجود رہا ہے۔ اور آج بھی ہے۔ اور یہ ہمیشہ سرمایہ دار اور برسراقتدار لوگوں کی بے اعتنائی اور عدمِ التفات کا شکار رہا ہے اور آج بھی ہے۔ اور وہ زندگی کی ہر منزل اور ہر موڑ پہ قدر ومنزلت، عزت ووقعت سے محروم رہا۔ انسانی تاریخ میں سب سے پہلے محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلم نے اس طائفہ کی جانب التفات فرمایا اور انسانی حقوق میں مساوات کا درجہ عطا فرمایا اوران کے ساتھ شفقت ومحبت کا اظہار فرمایا۔ اوران کے ساتھ اپنا انتساب فرمایا اور میدانِ حشر میں زمرۂ فقراء کے ساتھ اٹھائے جانے کی دعا فرما کر اس طائفہ کی قدر وقیمت ومنزلت اور عزت و رفعت کو زمین سے آسمان کر دیا۔ اللّٰھم احینی فقیرا وامتنی فقیرا واحشرنی زمرۃ الفقراء۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات گرامی کے ساتھ جس فقر اور فقیری کا انتساب فرمایا ہے وہ ایک الگ ہی معنی ومفہوم ہے۔ اس فقر نبویؐ کے ساتھ موجودہ زمانہ کی درویشانہ فقیری اور پیشہ ورانہ فقیری سر مو بھی مناسبت نہیں رکھتی۔ آنحضرت نے جس فقر پہ فخر (الفقر فخری) فقیری میرے لیے فخر ہے، فرمایا ہے۔ اس میں ایسی ایسی صفات اور ایسی ایسی خصلتیں ہیں کہ ان میں کسی ایک خصلت وصفت کی ہلکی پھلکی

سی جھلک بھی کہیں نظر نہیں ؛ ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک : اس فقرے کی تشریح کے لیے تو ہزاروں صفحات بھی ناکافی رہیں گے۔ صرف نظر اس بحث سے اتنی بات عرض کرنی ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس طائفہ کا خاص خیال رکھا۔ چنان چہ امام مسلم نے روایت کی ہے۔

نبئ کریمؐ نے فرمایا : من کان فی حاجتہ اخیہ کان اللہ فی حاجتہ ومن فرج عن مسلم کربۃ فرج اللہ عنہ کربۃ من کربات لوالقیامہ

جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت کو پورا کرنے میں مصروف اور منہمک رہے تو اس کی ضرورت کو اللہ تعالے پوری کرے گا اور جو شخص کسی مسلمان کی تکلیف و مصیبت کو دور کرے گا تو اللہ تعالے قیامت کے روز اس کی مصیبت دور فرمائے گا۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ کسی آدمی کے ساتھ اللہ کی مدد بھی اس وقت تک رہے گی جب تک کہ وہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔ واللہ عون مادام العبد فی عون اخیہ گویا انسانوں کی خدمت پر نصرت خداوندی منحصر ہے۔

غریب اور مفلوک الحال لوگوں کے ساتھ محبت و الفت اور اُن کے ساتھ ربط و ضبط اور ان سے نزدیک اور قریب رہنے میں قوم و ملک کے لیے فوائد ہیں اسی کے ذریعہ سماج اور معاشرہ کے مختلف طبقات کے درمیان میل جول اور تعاون و تناصر کی فضا قائم رہتی ہے اور یہی چیز کسی معاشرہ کو تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن کر سکتی ہے۔ اور جس سماج میں مساکین اور پسماندہ طبقات کو حقیر نگاہوں سے دیکھا جائے گا اور ان کے ساتھ تعلقات رکھنے کو عزت و وقار کے منافی سمجھا جاے تو پوری سوسائٹی میں اونچ نیچ، نفرت و حقارت، دشمنی و عداوت، کینہ و بغض اور عدم تعاون و ترک تعلقات کی فضا پیدا ہو جاے گی۔ جس کے بعد پوری قوم زوال و انحطاط اور ہلاکت کے دہانہ پر پہنچ جائے گی۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پس ماندہ لوگوں کے ساتھ محبت کرنے اور ان سے تعلق رکھنے کی ہدایت فرمائی۔

● ۲ — امرنی ان انظرالی من ھو دونی ولا انظرالی من ھو فوقی۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میرے حبیب صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے دوسری وصیت یہ فرمائی کہ تم اس شخص کی جانب نہ دیکھو جو تمہارے مقابلہ میں برتر اور بلند ہے۔ بلکہ اس شخص کو دیکھو جو تم سے کمتر اور پست ہے۔

یہ ایک نفسیاتی پہلو ہے۔ آدمی کسی شخص کو مال و دولت، صحت و عافیت اور شہرت و عزت اور اقتدار وغیرہ میں اپنے سے کم تر دیکھتا ہے تو اس کے اندر ایک طرح سے احساس ہونے لگتا ہے کہ خدا نے مجھے کتنی نعمتوں سے نوازا ہے اور اس کے اندر شکر کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور اس کے برعکس آدمی کسی شخص کو ان چیزوں کے اندر اپنے سے برتر دیکھتا ہے تو اس کے اندر ایک طرح سے احساس ہونے لگتا ہے کہ خدا نے کتنی نعمتوں سے محروم رکھا ہے اور یہی احساسِ کمتری اس کے اندر اخلاقی و عملی اور ایمانی کمزوری کو جنم دیتی ہے اور وہ شخص اپنے پاس جو بھی موجود نعمتیں ہیں ان کی جانب التفات نہیں کرتا اور ان نعمتوں کی قدر و احساس اور شکر گزاری سے عاری ہو جاتا ہے۔ اسی لیے نبی کریمؐ نے اپنے سے پست اور کم درجہ آدمی کی جانب دیکھنے کی تاکید فرمائی اور اپنے سے برتر آدمی کی جانب توجّہ کرنے سے منع فرمایا۔

اس وصیت کی مزید تشریح کے لیے عبداللہ بن عمروؓ کی روایت کردہ حدیث بڑی معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ فرماتے ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: خصلتان من کانتا فیہ کتبہ اللہ شاکرا وصابرا من نظر فی دینہ الی من ہو فوقہ فاقتدیٰ بہ ونظر فی دنیاہ الی من ہو دونہ فحمد اللہ علی ما فضلہ اللہ علیہ کتبہ اللہ شاکرا وصابرا ومن نظر فی دینہ الی من ہو دونہ ونظر فی دنیاہ الی من ہو فوقہ فاسف علی ما فاتہ لم یکتبہ اللہ شاکرا وصابرا

دو خصلتیں ہیں جس کسی میں جمع ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اس کو صابر اور شاکر لکھ دیتا ہے۔ جس کسی نے دین کے معاملہ میں اپنے سے برتر اور اونچے شخص کو دیکھا اور اپنے اعمال اور تقویٰ سے اس کے عمل اور تقوی سے موازنہ کیا اور خود کو کمتر پایا۔ ایسی صورت میں وہ اپنے سے برتر شخص کی پیروی کرے گا اور اس کے اندر دین کے معاملہ میں آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہوگا۔

اور جس کسی نے دنیا کے معاملہ میں اپنے سے کمتر آدمی کو دیکھا اور اپنے آپ کو اس شخص کے مقابلہ میں اونچا اور برتر پایا اور اپنے پاس موجود سامان عیش و عشرت کو دیکھا تو اس کے اندر شکرِ الٰہی کے جذبات پیدا ہو جائیں گے کہ خدا نے مجھے اس کے مقابلہ میں بہت کچھ نوازا ہے۔

اور جو شخص دین کے معاملہ میں اپنے سے کم تر اور کم درجہ آدمی کی جانب نظر کیا تو اس کے اندر یہ احساس پیدا ہو جائے گا کہ میں تو اس آدمی کے مقابلہ میں زیادہ دین دار اور متقی و پرہیزگار ہوں پھر اس کا یہی احساس اس کے نیک عمل کی رفتار کو سست کر دے گا۔

اور جو شخص دنیا کے معاملہ میں اپنے سے برتر اور اعلیٰ آدمی کو دیکھا تو اس کے اندر یہ احساس پیدا ہو جائے گا کہ اس کے اندر کتنی نعمتیں ہیں اور دنیا بھر کے سارے اسباب وسامان موجود ہیں اور میں اس کے مقابلہ میں بالکل تہی دست اور خالی ہاتھ ہوں اور اسی کمی کے احساس سے وہ رنج وغم اور رشک وحسد میں مبتلا ہو جائے گا اور افسوس کرتا رہے گا۔ کہ میرے پاس فلاں چیز نہیں ہے، فلاں شئے نہیں ہے۔

ایسے دونوں شخص جو دین کے معاملہ میں کم تر کو دیکھے اور دنیا کے معاملہ میں برتر کو دیکھے تو اللہ تعالیٰ ان کو شاکر وصابر نہیں لکھے گا۔ اسی لیے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ آدمی کو دین کے معاملہ میں برتر شخص کو دیکھنے کی تاکید فرمائی اور دُنیا کے معاملہ میں کم تر شخص کو دیکھنے کی تاکید فرمائی اور اسی میں زندگی کا چین وسکون اور دینی ترقی چھپی ہوی ہے۔

• ۳ ــــ امرنی ان اصل الرحم وان ادبرت

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہٗ فرماتے ہیں کہ میرے حبیب صلے اللہ علیہ وسلم نے تیسری وصیت یہ فرمائی کہ میں اپنے رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کروں بھلے سے وہ میرے ساتھ تعلقات توڑ لیے ہوں۔

صلہ رحم اور قطع رحم اسلام کی خاص اصطلاحات ہیں۔ عربی زبان میں قرابت داروں کا حق ادا کرنے کو صلہ رحم کہتے ہیں اور رشتہ داروں کا حق ادا نہ کرنے کو قطع رحم کہتے ہیں۔ نبی کریمؐ نے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرنے کی تاکید فرمائی اور اُن رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم دی جو تعلقات توڑ چکے ہیں۔ چنانچہ ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا:

لیس الواصل بالمکافی ولکن الواصل اذا قطعت رحمہ وصلھا

صلہ رحمی اس کا نام نہیں کہ جو رشتہ دار ہمارے ساتھ تعلقات قائم رکھے ہوں تو ہم بھی ان کے ساتھ تعلقات استوار رکھیں اور جن قرابت داروں نے ہمارے ساتھ حسنِ سلوک کیا تو اس کے جواب میں ہم بھی ان کے ساتھ حسنِ سلوک کریں۔ بلکہ حقیقی صلہ رحمی یہ ہے کہ آدمی ان رشتہ داروں کے ساتھ نیکی اور حسنِ سلوک کرے جو اس کے ساتھ تعلقات نہ رکھے ہوں اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک نہیں کرتے ہیں۔

ایک شخص بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے ایسا عمل بتلائیے جو جنّت میں لے جائے۔ ارشاد فرمایا۔ اللہ کی بندگی کرو۔ شرک سے بچو۔ نماز پڑھو۔ زکوٰۃ دو اور رشتہ داروں

کا حق ادا کرو۔ اخبرنی بعمل یدخلنی الجنۃ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعبد اللہ ولا تشرک بہ شیأ وتقیم الصلوٰۃ وتوتی الزکوٰۃ وتصل الرحم۔

ایک اور موقعہ پہ ارشاد فرمایا: جس کو یہ بات پسند ہو کہ اس کے رزق میں وسعت ہو اور اس کی عمر میں برکت ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ رشتہ داروں کا حق ادا کرے۔

- ۴۔ امرنی ان لا اسأل احداً شیأً

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے حبیب صلے اللہ علیہ وسلّم نے چوتھی وصیت یہ فرمائی کہ میں کسی سے کوئی چیز نہ مانگوں۔

نبیٔ کریمؐ نے حضرت ابوذر غفاریؓ کے علاوہ دیگر صحابہؓ کو بھی سوال کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اس سلسلہ میں احادیث کے اندر مختلف صحابہؓ کے نام اور واقعات کی تفصیل ملتی ہیں۔ بعض تنگدست مہاجر صحابہؓ سے اس بات پہ بیعت لی کہ وہ کسی سے کوئی سوال نہیں کریں گے۔ چنان چہ جن لوگوں سے آپؐ نے بیعت لی تو اس کا ان کے دلوں پہ اتنا اثر ہوا کہ اگر ان میں کوئی گھوڑے پر سوار ہوتا ہے اور اس کے ہاتھ سے کوڑا گر جاتا ہے تو وہ کسی سے اٹھا کر دینے کے لیے سوال نہیں کرتا بلکہ خود ہی گھوڑے سے اتر کر لیتا تھا۔

ایک مرتبہ بارگاہِ رسالت میں ایک صحابی حاضر ہوے اور اپنی حاجت اور ضرورت پورا کرنے کے لیے عرض کیا۔ تو آپؐ نے سائل سے کہا تمہارے نزدیک کوئی ساز و سامان ہے تو انھوں نے عرض کیا: فلاں فلاں چیزیں ہیں۔ حضورؐ نے حکم دیا کہ وہ چیزیں لے آؤ۔ چنان چہ جب وہ اشیا آپؐ کی خدمت میں پیش ہوئیں تو آپؐ نے حراج فرمایا۔ اور یہ رقم سائل کے حوالہ کی اور فرمایا: اس سے ایک کلہاڑی خرید و اور جنگل میں جا کر لکڑیاں کاٹو اور فروخت کرو اور اس میں کچھ رقم سے اپنی بیوی بچّوں کے کھانے پینے کا سامان خریدو۔ چناں چہ حسب ارشاد انھوں نے ایسا ہی کیا۔ ایک ہفتہ کے بعد جب وہ بارگاہ نبوت میں آپہنچے تو اُن کے جسم پہ نیا اور عمدہ لباس تھا۔

سوال کی ممانعت کا حکم حالات اور مواقع سے تعلق رکھتا ہے۔ حالات کوئی جامد اور ساکت چیز نہیں ہے۔ ان میں نشیب و فراز اور تغیّر و تبدیلی کا سلسلہ ہمیشہ قائم رہتا ہے: وتلک الایام نداولھا بین الناس اور مواقع کب اور کیا صورت پیدا کردیں یہ کسی آدمی کے علم و اندازہ سے باہر ہے۔ کسی شخص کے لیے کسی بھی وقت ایسے حالات اور ایسے مواقع سامنے آسکتے ہیں جن میں وہ دوسروں سے مدد لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی لیے اسلام نے

سوال کے مسئلہ پر دونوں پہلو سے روشنی ڈالی ہے۔ سوال بعض حالات میں روا ہے تو بعض حالات میں ناروا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث میں جہاں دستِ سوال دراز کرنے سے منع کیا گیا ہے وہاں سائل کی ضرورت کو پورا کرنے کی ترغیب بھی دلائی گئی ہے۔ سوال کی ممانعت کے پیچھے شارع علیہ السلام کے کئی ایک مقاصد ہیں۔ معاشرہ سے گداگری کی لعنت ختم کرنا۔ بے ضرورت سوال کرنے سے باز رکھنا۔ ایک دوسرے کا دست نگر بن کر زندگی گزارنے سے روکنا۔ ایک دوسرے کے لیے بوجھ اور تکلیف کا باعث نہ ہونا، حرکت و عمل سے باز نہ رہنا۔ جمود و تعطل سے باز رہنا، بے روزگاری کو ختم کرنا وغیرہ۔

سوال کی ممانعت سے متعلق اس قدر شدید تنبیہات اور تاکیدات کے باوجود سائل کے سوال کو پورا کرنے کی ترغیب و تاکید بھی ملتی ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہی کو حکم دیا گیا کہ آپؐ سائل کو نہ جھڑکیں

واما السائل فلا تنھر۔

اس تعلیم کے پیچھے بجز اس کے اور کیا مقصد ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی واقعی معذور و مجبور اور حقیقی حاجت مند کوئی سوال کر بیٹھے تو اس کی مدد کرنے سے لوگ پیچھے نہ رہ جائیں اور لوگوں میں داد و دہش اور عطا و بخشش اور سخاوت کے جذبات زندہ رہیں اور دوسروں کے دکھ درد اور تکلیف و مصیبت اور ضرورت و حاجت کا احساس موجود رہے۔

اگر سوال کے پیچھے حرص و طمع اور مال و زر کے حصول کے جذبات اور مقاصد ہوں تو یہی سوال خود سائل کے لیے عذاب بن جاتا ہے اور وہ قیامت میں اس طرح اٹھے گا کہ اس کے چہرہ سے گوشت نوچ لیا گیا ہے جیسا کہ اس کی وضاحت بعض احادیث میں موجود ہے۔

امام ترمذی نے یہ حدیث نقل کی ہے: حضرت حکیم بن حزامؓ نے نبئ کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے کئی مرتبہ سوال کیا: آپؐ نے ان کا ہر سوال پورا کیا۔ لیکن آخر میں یہ کہہ دیا: اے حکیم! یہ مال نہایت مرغوب چیز ہے، جو شخص اس کو ضرورت کی وجہ سے لیتا ہے تو اللہ تعالےٰ اس میں برکت عطا فرماتا ہے اور جو شخص حرص و طمع کے ساتھ لیتا ہے اس میں برکت نہیں ہوتی۔ اور وہ شخص اس آدمی کی طرح بن جاتا ہے جو کھاتا تو بہت ہے لیکن اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی اس فہمائش کا اثر حکیم ابن حزامؓ پر اس قدر ہوا کہ اس کے بعد انھوں نے سوال کرنا تو بڑی چیز ہے کسی سے ہدیہ تک قبول نہیں کیا۔

یہ حقیقت ہے کہ سوال کرنے سے اور کسی بھی جائز و ناجائز معاملہ میں مطالبہ کرنے سے مال و اسباب تو جمع ہو جاتے

ہیں اور ان کی کثرت بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر سائل کے قلب میں استغناء اور بے نیازی نہیں ہے تو اس کی محتاجی کبھی ختم نہیں ہوتی اور وہ دنیا جہاں کا مال پانے کے باوجود بھی فقیر اور کنگال ہی رہتا ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرمؐ نے مجھ سے پوچھا: اے ابوذر! کیا مال کی کثرت و بہتات کا نام بے نیازی ہے؟ میں نے عرض کیا ہاں، یا رسول اللہ! یہ سن کر آپؐ نے فرمایا: جب تو تمہارے نزدیک مال کی قلّت کا نام محتاجی ہے۔ میں نے عرض کیا: ہاں!

یہ سن کر آپؐ نے فرمایا: بے نیازی دل کی بے نیازی ہے اور محتاجی دل کی محتاجی ہے۔

۵ — امرنی ان اقول بالحق ولو کان مرًّا

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے حبیب صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے پانچویں وصیت یہ فرمائی کہ میں حق بات کہوں اگرچہ کہ وہ دوسروں کو کڑوی معلوم ہو۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کے مزاج میں حق گوئی و بے باکی اور صاف گوئی کا مادہ بدرجہ اتم موجود تھا اور آپؓ اس وصف میں سارے صحابہؓ کے درمیان ممتاز اور نمایاں تھے۔ آپؓ کی جرأت و ہمت اور حق گوئی کا مظاہرہ تو اسی وقت ہوا جب کہ آپؓ مشرف بہ اسلام ہوے۔ چنانچہ حرم شریف میں پہنچ کر قریش کے بھرے مجمع میں اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا تو چاروں طرف سے کفّار قریش آپؓ پہ ٹوٹ پڑے، یہاں تک کہ آپؓ لہولہان ہوگئے لیکن نعرۂ حق بلند کرنے سے باز نہیں آے۔ اسی اثناء میں آپؓ کو جاننے والا ایک شخص آپہنچا اور اس نے آپؓ کو دیکھ کر کفّار قریش سے کہا یہ تو قبیلۂ غفار کا آدمی ہے۔ اس کے ساتھ یہ سلوک نہ کرو ورنہ تمہارے لیے بڑی مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔ یہ سن کر لوگ الگ ہوگئے۔

حضرت ابوذر غفاریؓ جس بات کو حق سمجھتے، اس کے اعلان اور اظہار میں کبھی پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ چنانچہ آپؓ نے سرمایہ داری اور ذخیرہ اندوزی کے خلاف آواز اٹھائی اور اس سلسلہ میں خلیفۂ وقت اور سرکاری حکام سے بحث کرنے اور اپنے موقف کی وضاحت کرنے میں کبھی نہیں ہٹتے تھے۔

حق بات کہنے کے بارے میں رکاوٹ پیدا کرنے والی چیزوں میں عموماً لوگوں کو لعن وطعن کا خوف دامن گیر رہتا ہے اور اظہار حق کی وجہ سے جان و مال کے نقصان کا خوف پیدا ہو جاتا ہے یا آدمی کے سامنے مادی فوائد پیش نظر رہتے ہیں، جس کی وجہ سے حق گوئی آدمی کے لیے دشوار گزار ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ بات ایسے لوگوں کے اندر ہوتی ہے جن میں شجاعت کا اخلاقی وصف ناپید رہتا ہے اور جن لوگوں کے اندر شجاعت کا وصف بدرجۂ اتم موجود ہو اور وہ دُنیا و اہلِ دُنیا

کو خاطر میں نہ لاتے ہوں اور جن کے پاس مصلحت اور منفعت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی اور وہ اظہارِ حق میں اپنے ضمیر اور قلب کے لیے راحت محسوس کرتے ہیں، وہ کبھی بھی حق بات کہنے میں تامل نہیں کرتے اور کسی طرح کی روباہی چال نہیں چلتے۔ اقبال مرحوم نے کہا ہے: ؎

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اور یہ بڑا نازک مرحلہ ہوتا ہے۔ ظالم حکومت اور ظالم بادشاہ اور ظالم لوگوں کے سامنے صاف صاف اور کھری کھری باتیں کہہ دیں۔ اس قسم کی حق گوئی کو نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بہترین جہاد قرار دیا۔ افضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر۔

مالک بن انس کا بیان ہے کہ میں اور ابن طاؤس خلیفہ منصور کے بلانے پر اس کے دربار میں پہنچے، وہ ایک عالی شان اور بیش قیمت فرش پر بیٹھا تھا اور اس کے آس پاس میں دفتری اشیاء پھیلی ہوئی تھیں اور ایک سیف بردار جلاد اس کے پیچھے اس طرح کھڑا ہوا تھا کہ جوں ہی کسی کی گردن زنی کا حکم ملے تو وہ فوراً گردن اڑا دے۔

منصور نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور اس کے بعد کچھ دیر اپنے کاموں میں مصروف رہا۔ اس کے بعد ہماری طرف متوجہ ہوا اور ابنِ طاؤس سے کہا کہ آپ کے جدِ امجد سے کوئی حدیث سنائیے۔ ابنِ طاؤس نے کہا میں نے اپنے والد سے سُنا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اشد الناس عذابا يوم القيامة رجل اشركه الله فى حكمه فادخل عليه الجور فى عدله: قیامت کے روز لوگوں میں سب سے زیادہ عذاب اس آدمی کو دیا جائے گا جس کو اللہ تعالے نے بادشاہت دی اور وہ شخص عدل کی بجائے لوگوں پر ظلم کیا۔

مالک فرماتے ہیں میں یہ بات سُن کر دہشت زدہ رہ گیا اور یقین کر لیا کہ ابن طاؤس کا سر قلم ہو جائے گا۔ کچھ دیر کے لیے خاموشی رہی اور ہم لوگ منصور کے پاس بیٹھے ہی رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد خلیفہ پھر ابن طاوس کی طرف متوجہ ہوا اور کہا کوئی نصیحت کی بات سنائیے۔ ابن طاؤس نے کہا: اے خلیفہ! کیا آپ نے یہ آیات نہیں پڑھی:

الم تر كيف فعل ربك بعاد ارم ذات العماد التى لم يخلق مثلها فى البلاد وثمود الذين جابوا الصخر بالواد وفرعون ذى الاوتاد الذين طغوا فى البلاد فاكثروا فيها الفساد فصب عليهم ربك سوط عذاب ان ربك لبالمرصاد ۰

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے قوم عاد کے ساتھ کیا کیا۔ (ان کی طرف حضرت ہودؑ نبی بنا کر بھیجے گئے تھے انھوں نے تکذیب کی بالآخر اللہ تعالےٰ نے سخت ہوا کا عذاب ان پر نازل کیا جو متواتر سات راتیں اور آٹھ دنوں تک چلتی رہی اور انھیں تہس نہس کر کے رکھ دیا۔) ستونوں والے ارم کے ساتھ کیا کیا۔ جس کی مانند کوئی قوم ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی۔ (ارمؑ قوم عاد کے دادا کا نام ہے۔ یہ عادِ اولیٰ ہے ستونوں والے سے اشارہ ہے ان کی قوت وطاقت اور درازقامتی کی طرف۔ علاوہ ازیں وہ فن تعمیر میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے اور نہایت مضبوط بنیادوں پر عظیم الشان عمارتیں تعمیر کرتے تھے ان جیسی درازقامت اور قوت وطاقت والی قوم کوئی اور پیدا نہیں ہوی۔ یہ قوم کہا کرتی تھی ہم سے زیادہ کوئی طاقت ور ہے ہم) اور ثمودیوں کے ساتھ کیا کیا۔ جنھوں نے وادی میں بڑے بڑے پتھر تراشے تھے۔ (یہ حضرت صالحؑ کی قوم تھی۔ اللہ نے اسے پتھر تراشنے کی خاص صلاحیت اور قوت عطا کی تھی۔ حتیٰ کہ یہ لوگ پہاڑوں کو تراش کر ان میں اپنی رہائش گاہیں تعمیر کر لیتے تھے۔)

اور فرعون کے ساتھ کیا کیا۔ جو میخوں والا تھا۔ (اس کا مطلب یہ ہے کہ بڑے لشکروں والا تھا۔ جس کے پاس خیموں کی کثرت تھی۔ جنھیں میخیں گاڑ کر کھڑا کیا جاتا تھا یا اس سے اس کے ظلم وستم کی طرف اشارہ ہے کہ میخوں کے ذریعہ وہ لوگوں کو سزائیں دیتا تھا۔) ان سبھوں نے شہروں میں سر اٹھا رکھا تھا اور بہت فساد مچا رکھا تھا۔ آخر تیرے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا یعنے ان پر آسمان سے اپنا عذاب نازل فرما کر اُن کو تباہ وبرباد کر دیا اور انھیں عبرتناک انجام سے دوچار کر دیا۔)

مالک بن انس فرماتے ہیں کہ اس مرتبہ میں تو مارے خوف کے اپنے کپڑوں کو سمیٹ لیا کہ یہ ان کے خون سے رنگین نہ ہو جائیں گے لیکن منصور کی طرف سے کوئی ردّ عمل دیکھنے میں نہیں آیا۔ پھر وہ اپنے سرکاری اور دفتری کاغذات ودستاویزات کی جانب متوجّہ ہو گیا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ وہ غیر اختیاری طور پر ابن طاؤس سے کہا کہ وہ دوات دیجیے جو آپ کے پہلو میں موجود ہے۔ ابن طاؤس نے یہ بات سُن کر بھی دوات کی جانب ہاتھ نہیں بڑھایا۔ یہ دیکھ کر منصور نے کہا۔ دوات دینے میں آپ کو کیا چیز مانع ہو گئی؟ ابن طاؤس نے کہا: اخشی ان تکتب بھا معصیة اللہ فاکون شریکك فیھا: مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم اس دوات سے کوئی حکم نہ جاری کر دیں جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور ظلم پر مبنی ہو اور میں اس گناہ اور ظلم کے کام میں تمہارا معاون اور مددگار نہ ٹھہروں!

منصور نے جب یہ بات سُنی تو اس کا چہرہ غصّہ سے سُرخ ہو گیا اور کہا: یہاں سے نکل جاؤ۔ ابن طاؤس فوراً

اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا: ہم تو یہی چاہتے تھے۔

• ٦ ـــ ان لا اخاف فی اللہ لومۃ لائم

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے چھٹی وصیت یہ کی کہ میں اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت گر کی ملامت کی جانب توجہ نہ دوں۔

حضور اکرمؐ نے حضرت ابوذرؓ غفاری کے علاوہ بعض صحابہ کرامؓ سے بیعت تک لی تھی کہ دین کے معاملہ میں وہ کسی بھی عیب چینی کی جانب توجہ نہیں کریں گے اور کلمۂ حق کہنے سے باز نہیں آئیں گے۔ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ جب کسی شخص یا کسی گروہ کی جانب سے ملامت و مذمت اور عیب کے اظہار کا خوف پیدا ہو جائے تو آدمی کا جذبۂ عمل متاثر ہو جاتا ہے اور وہ ملامت گر اور عیب چین لوگوں کے ڈر سے اعمال خیر کی انجام دہی سے رُک جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے خیر و نیکی کی اشاعت اور تعمیر و ترقی کے عمل میں خلل پیدا ہو جاتا ہے۔ جو ایک طرح سے دینی، علمی، قومی و ملکی کام ٹھپ پڑ جاتے ہیں۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی کہ امورِ خیر کی انجام دہی میں نکتہ چینی و ملامت گیری کی جانب توجہ ہی نہ دیں اور سب سے بے نیاز ہو کر قدم بڑھاتے ہی چلیں کیوں کہ اسی میں فرد کی ترقی اور قوم کی ترقی چھپی ہوئی ہے۔

ملامت گری اور نکتہ چینی کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ جو کسی درجہ میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص لوگوں کی نکتہ چینی کے خوف سے خود کو ظلم و زیادتی، گناہ و بدکاری اور انتقام و تخریب سے باز آجاتا ہے تو یہ بڑی اچھی صورتِ حال ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ نصیحت کا مقصد یہی ہے کہ ملامت گروں کے خوف و اندیشہ سے امر معروف اور نہی منکر کا عمل متروک نہ ہو جائے۔ اور دعوت و اصلاح اور اظہارِ حق کا کام صرف علماء و مشائخ اور برسرِ اقتدار گروہ ہی کا نہیں بلکہ ہر کلمہ گو کی دینی و اخلاقی ذمہ داری ہے کہ اس کے علم کی حد تک جو بھی بھلی بات معلوم ہے وہ دوسروں تک پہنچائے اور اس کے علم میں جو بھی بُری بات ہے اس کے روکنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من رای منکم منکر فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان۔

تم میں سے جو بھی کسی برائی کو دیکھے تو اپنی قوت و طاقت اور اثر و رسوخ کے ذریعہ ختم کرو اور اگر یہ قوت نہیں ہے تو

کم از کم زبان کے ذریعہ اس برائی کو ختم کرو اور اگر زبان ہلانے کی بھی طاقت نہیں ہے تو کم از کم اس برائی کو اپنے دل میں برا خیال کرو اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

دنیا کو خیر و نیکی اور صلاح و فلاح سے معمور کرنے اور شر و برائی کو مٹانے کی اس سے بڑھ کر سعیٔ محمود نہیں ہو سکتی کہ سوسائٹی کا ہر آدمی اپنے عمل اور اپنی اصلاح کے ساتھ دوسروں کے عمل اور اصلاح کی جانب بھی توجّہ دے اور اپنے امکان و قوت کے مطابق قدم اٹھائے۔ اسی کردار کی وجہ سے مسلمانوں کو قرآنِ کریم نے خیر امت کا خطاب دیا۔ کنتم خیر امت اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر: تم بہترین افراد ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کئے گئے ہو تاکہ خیر کو عام کریں اور شر کو ختم کریں۔

سورۂ مائدہ کی ایک آیتِ طیبہ سے متعلق بعض عام صحابہ نے یہ سوچا تھا کہ آدمی کے لیے صرف اپنی اصلاح اور اپنے عمل کی فکر کافی ہے۔ دوسروں کی گمراہی اور بے عملی سے کوئی سروکار نہیں اور وہ آیت یہ ہے:

یا ایھا الذین اٰمنوا علیکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم ۰ اے ایمان والو! تم اپنی فکر کرو جب تم ہدایت پر ہو تو دوسرے شخص کی گمراہی تمہارے لیے کوئی نقصان دہ نہ ہوگی۔

نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہؓ سے فرمایا یہ آیت امر معروف کے احکام کے خلاف نہیں ہے اگر امر معروف اور نہی منکر کو ترک کرو گے، تمہیں بھی گناہ گاروں کے ساتھ شامل کیا جائے گا۔

مذکورہ آیت سے متعلق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہٗ کا ایک بیان تفاسیر میں ملتا ہے کہ آپؓ نے اپنے ایک خطبہ میں کہا:

لوگو! تم اس آیت کو پڑھتے ہو اور اس کو بے محل منطبق کرتے ہو کہ امر معروف اور نہی منکر کی ضرورت نہیں، یاد رکھو، میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ جو لوگ گناہوں اور برائیوں کو اپنی آنکھوں دیکھیں اور ان کے انسداد کی قوت رکھنے کے باوجود کوشش نہ کریں تو اللہ تعالےٰ ان کو بھی مجرموں اور گناہ گاروں کے ساتھ عذاب میں گرفتار کرے گا۔

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات کا اثر یہ ہوا کہ صحابۂ کرام دین کے معاملہ میں کسی بھی ملامت گر کی جانب توجّہ ہی نہیں دیتے تھے۔ چنان چہ ان کا یہ کردار اور وصف اُن کی شخصیتوں کا جُزو اور اُن کی علامت قرار پایا اور قرآنِ کریم نے ان بزرگوں کے اس عمل کی تصدیق ان الفاظ میں کی، لایخافون لومۃ لائم: یہ لوگ کسی ملامت گر سے خوف نہیں کھاتے ہیں۔

حضرت حذیفہ الیمان کا ایک واقعہ بڑا سبق آموز اور عبرت خیز ہے۔ جس سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ ایک مسلمان کو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے عمل اور طریقے کو دل وجان سے محبوب رکھنا چاہیے۔ اور اس پر عمل کرنے سے لوگ تمسخر کریں یا حقیر سمجھیں یا ملامت کریں تو ان باتوں کی طرف دھیان نہیں دینا چاہیے۔

حضرت حذیفہ ایران پہنچے جہاں آپ کو شاہِ ایران کسریٰ اور اس کے وزراء کے ساتھ مذاکرات کرنا تھا۔ حکومت کی جانب سے آپ کے اعزاز میں ایک پُر تکلف عالی شان دعوت دی گئی۔ جس میں سلطنت کے اراکین اور ملکی وغیر ملکی اور مقتدر شخصیتیں مدعو تھیں۔

حضرت حذیفہ نے کھانا شروع کیا تو دورانِ طعام آپ کے ہاتھ سے نوالہ نیچے گر گیا۔ آپ نے نوالہ کو اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس لیے کہ نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے کہ کھانے کے دوران کوئی نوالہ گر جائے اور وہ کھانے کے قابل ہو تو اس کو اٹھا کر کھا لینا چاہیے۔ معلوم نہیں اللہ تعالےٰ نے رزق کے کس دانہ اور کس حصّہ میں برکت رکھی ہے۔

حضرت حذیفہ کے پہلو میں ان کے ایک ساتھی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ جوں ہی انھوں نے دیکھا کہ حضرت حذیفہ ایک گرے ہوئے نوالہ کو اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھا رہے ہیں تو فوراً منع کیا اور آہستہ سے کہا: یہ لوگ بڑے مہذب وشائستہ ہیں۔ آپ کی اس حرکت سے ہمیں حقیر اور نا دیدہ نہ خیال کریں۔ لیکن حضرت حذیفہ نے اپنے ساتھی کی بات نہیں مانی اور وہ گرا ہوا نوالہ اٹھا کر کھا لیا اور اپنے ساتھی سے کہا: أأترك سنة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لھولاء الحمقاء؛ رفیق من! کیا میں ان بے وقوفوں کی وجہ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سنّت چھوڑ دوں؟

- ۷ ـــ ان اکثر من قول لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم

حضرت ابوذر غفّاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتویں وصیت یہ فرمائی کہ میں ہمیشہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم پڑھتا رہوں۔

نبیٔ کریمؐ نے حضرت ابوذر غفاریؓ کے علاوہ بہت سارے صحابۂ کرامؓ کو اس طرح کے مختلف ومتعدد کلمات پڑھنے کی تعلیم اور تلقین فرمائی ہے ان کلمات میں مخصوص اثرات وخاصیات اور بے شمار فوائد و برکات ہیں، جن کی نشاندھی خود نبیٔ کریمؐ نے فرمائی ہے۔ سورۂ کہف کی ایک آیت کے اس حصہ والباقیات الصالحات کی تفسیر میں مختلف اقوال ملتے ہیں

ان میں سے بعض مفسرین مثلاً ابن عباس، عکرمہ اور مجاہد وغیرہ کا قول یہ ہے کہ باقیات صالحات سے مراد لاحول ولاقوۃ الاباللہ العلی العظیم ہے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ کا بیان ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: باقیات صالحات کو زیادہ سے زیادہ جمع کرو۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ وہ کیا ہیں؟ تو ارشاد فرمایا: سبحان اللہ لا الٰہ الا اللہ الحمد للہ اللہ اکبر ولاحول ولاقوۃ الاباللہ العلی العظیم۔

عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں ایک بار بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا اور اس وقت میری زبان سے لاحول ولا قوۃ الاباللہ کے جملے صادر ہو گئے۔ یہ سن کر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: جانتے ہو اس کی تفسیر کیا ہے؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: لاحول عن معصیۃ اللہ: اللہ کی نافرمانی سے بچنے کی طاقت نہیں ہے مگر اللہ کی ہدایت اور فضل سے۔ لاقوۃ علی طاعۃ اللہ الا بعون اللہ: اللہ کی طاعت و فرماں برداری کی طاقت نہیں ہے مگر اللہ کی مدد سے۔

شبِ معراج کے واقعات میں منقول ہے: ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم اسریٰ بہ مر علی ابراھیم علیہ الصلوٰۃ والسلام فقال یا محمد مُرامتك ان یکثروا من غراس الجنۃ لاحول ولاقوۃ الاباللہ۔

نبی کریمؐ شب معراج میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے گزرے تو انھوں نے فرمایا: اے محمدؐ! آپ اپنی امت کو حکم دو کہ وہ جنت کے باغوں کو بڑھائیں اور وہ باغات ہیں لاحول ولاقوۃ الاباللہ۔ مطلب یہ کہ ان کلمات کو کثرت سے پڑھا کرو۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دواء من تسعۃ وتسعین داءً ایسرھا الھم: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لاحول ولاقوۃ الاباللہ ننانوے ۹۹ بیماریوں کی دوا ہے۔ ان میں سے کم ترین بیماری غم سے نجات ہے۔

مذکورہ حدیث میں الھم کا لفظ موجود ہے جس کا معنیٰ ہے غم۔ الھم اس غم کو کہتے ہیں جو آدمی کو گھلا دیتا ہے اور یہ حزن سے شدید ترین ہے۔

اس مفہوم سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کلمہ انسان کو ایسے غم سے چھٹکارا دلاتا ہے جو اس کو اندر ہی اندر گھلا کر کھوکھلا کر دینے والا ہوتا ہے۔

مشہور تابعی حضرت مکحول نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا ایک قول نقل کیا: لاحول ولاقوۃ الا باللہ کو جو شخص پڑھتے رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ستر قسم کے نقصانات سے بچا لیتا ہے۔ ان میں سے ایک فقر و افلاس بھی ہے۔

ان کلمات سے متعلق یہ قول بھی ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے پڑھنے والے کا ذکر فرشتوں کی جماعت میں ان الفاظ کے ساتھ کرتا ہے: اسلم عبدی واستسلم: میرا بندہ اطاعت گزار ہوگیا اور اس نے نافرمانی چھوڑ دی اور اس نے دنیا کے امور مجھے سونپ دیا۔

حاصل کلام!

حضرت ابوذر غفّاری رضی اللہ عنہ کو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو سات نصیحتیں اور وصیتیں فرمائی ہیں وہ ہر مسلمان کو آویزۂ گوش بنا لینا چاہیے۔ جن کے اندر دین، دنیا اور آخرت کی بے شمار بھلائیاں موجود ہیں۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ٥

(بقیہ "جواھر القرآن" صہ 31 سے آگے۔

کہ وہ ہمارے لیے آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بن جائیں اور نجات وثواب کا ذریعہ بن جائیں۔

بندگانِ رحمان کی یہ صفت بھی ہے کہ وہ نیکی وتقویٰ کے معاملہ میں نہ صرف خود آگے آگے رہتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی نیکی و تقویٰ کی جانب مائل کرتے ہیں اور نیکی وتقویٰ کے میدان میں خود کو اس قدر آگے دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ متقیوں کے امام قرار پائیں۔

حاصل کلام! سورۂ فرقان کے اس آخری رکوع میں مبدأ، معاد اور دنیاوی زندگی سے متعلق بڑی مفید اور عبرت خیز آیات شامل ہیں جن کی تفسیرات کا مطالعہ تدبر اور تفکر کے ساتھ کیا جائے تو صاحب ایمان کے لیے روشنی اور بصیرت حاصل ہو سکتی ہے مشائخ صوفیا نے لکھا ہے۔ کہ جب تک کسی شخص کو صاحب علم، صاحب تقویٰ شیخ کامل نہ مل جائے اس وقت تک قرآن کریم کی تلاوت تدبر اور تفکر کے ساتھ کرے۔ یہی اس کے حق میں تزکیہ اور عبادت ہے۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ٥٥

وترکی نماز میں قنوت پڑھنے اور رفع یدین یعنی ہاتھوں کا کانوں تک اٹھا کر تکبیر کہنے کے تعلق سے احادیث کی روشنی میں یہ فتویٰ تحریر کیا گیا ھے جو احناف کے لیے اطمینان بخش ہے تو غیر احناف کے لیے سکوت کا باعث ھے۔ یہ تحریر حضرت مولانا مولوی ابوالناصر عبیدی مجددی کے قلم سے ساٹھ سال قبل معرض وجود میں آئی۔ موجودہ دور میں اس مسئلہ کی اھمیت اور ضروریات کے پیشِ نظر یہ فتویٰ قارئین اللطیف کی خدمت میں پیش ھے۔

قنوت وتر کی تحقیق..... احادیثِ صحیحہ اور آثارِ صحابہؓ کی روشنی میں

مسئلہ قنوت وتر اور رفع یدین

وتر کی تیسری رکعت میں دعاء قنوت پڑھنی چاہیے یا نہیں؟ اور قنوت کے لیے ہاتھ اٹھا کر تکبیر کہنا احادیث و آثارِ صحیحہ سے ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب : تیسری رکعت وتر میں رکوع سے قبل دعاء قنوت پڑھنا اور اس کے لیے دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھا کر تکبیر کہنا احادیث و آثارِ صحیحہ سے ثابت ہے۔ جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ عن عبدالرحمٰن بن ابی لیلی انہ سئل عن القنوت فی الوتر فقال حدثنا البراء بن عازب قال سنۃ ماضیہ اخرجہ السراج ولاسنادہ حسن۔ (آثار السنن: ص ۱۰: ج ۲)

عبدالرحمٰن بن ابی لیلی سے وتر کی دعائے قنوت کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: مجھ سے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ یہ ایک جاری شدہ سنّت ہے۔

۲۔ عن ابی بن کعب ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یوتر بثلث رکعات کان یقراء فی

الاولیٰ سبح اسم ربك الاعلیٰ وفی الثانیہ بقل یاایھا الکافرون وفی الثلاثۃ بقل ھواللہ احد ویقنت قبل الرکوع ۔ (رواہ النسائی: ص ۲۴۸: ج ۱)

یعنی ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تحقیق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تین رکعتوں کے ساتھ وتر کرتے تھے جن میں سے پہلی رکعت میں سبح اسم ربك الاعلیٰ دوسری میں سورۃ الکافرون، تیسری میں سورۂ اخلاص پڑھتے تھے اور رکوع سے قبل دعائے قنوت پڑھتے تھے۔ اس کو نسائی نے روایت کیا ہے۔ اور تلخیص الحبیر میں ہے کہ اس کو ابو علی بن السکن رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں بیان کیا ہے اور کہتا ہے کہ اس کو عقیلیؒ نے حجۃ قرار دیا ہے۔ قنوت فی الوتر کے لیے جس سے اشارہ ہوتا ہے اس کی صحت کی طرف اور بخاری کے حاشیہ میں ہے کہ قال العینی ورواہ ابن ماجہ بسند صحیح۔ یعنی علامہ عینی نے فرمایا ہے کہ ابن ماجہ نے بھی اس کو صحیح سند سے روایت کیا ہے۔

۰۳ حدثنا یزید بن ھارون قال حدثنا ھشام الدستوائی عن حماد وھو ابن ابی سلیمان عن ابراھیم عن علقمۃ عن بن مسعود واصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم انھم کانوا یقنتون فی الوتر قبل الرکوع رواہ ابن ابی شیبۃ فی مصنفہ وھذا رسند صحیح علی شرط مسلم۔ (الجواھر النقی: ص ۲۱۲ ج ۱)

یعنی حدیث بیان کی یزید بن ہارون نے ہشام دستوائی سے انھوں نے حماد بن ابی سلیمان سے انھوں نے ابراہیم سے انھوں نے علقمہ سے انھوں نے ابن مسعود اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے کہ وہ رکوع سے قبل دعاء قنوت پڑھتے تھے اس کو ابی ابن شیبہ نے اپنے مصنف میں روایت کیا ہے اور یہ سند بالکل صحیح ہے امام مسلم کی شرائط کے مطابق۔ نیز حافظ بن حجر نے نصب الرایہ میں صفحہ ۱۱۶ میں کہا ہے کہ اس کی اسناد حسن ہے۔ نیز ابن ابی شیبہ نے ایک اثر عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا ہے۔ دوسری سند صحیح ہے لیکن وہ مرسل ہے اور مرسل احناف کے نزدیک حجت ہے۔ اور طبرانی نے اپنی معجم میں اس کو روایت کیا ہے اور حافظ نے تلخیص الرایہ میں بھی اس کی تصحیح کی ہے۔

۰۴ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جزء رفع الیدین میں ایک اثر بیان کیا ہے اور کہا ہے: صحیح عن الامسعود عن عبداللہ انہ کان یقرفی آخر رکعت من الوتر قل ھواللہ احد ثم یرفع یدیہ فیقنت قبل الرکوع۔ (جزء رفع الیدین: ص ۲۸) یعنی عبداللہ بن مسعود سے بروایت صحیحہ مروی ہے کہ وہ وتر کی آخر رکعت میں قل ھو اللہ احد پڑھتے تھے پھر رفع یدین (ہاتھوں کو اٹھانا) کرتے تھے اور رکوع سے قبل قنوت پڑھتے تھے۔

۰۵ وعن عبداللہ انہ کان یکبر حین یفرغ من القراۃ فاذا فرغ من القنوت کبر فرکع رواہ الطبرانی

فی الکبیر۔ یعنی عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ وہ قرأت سے فارغ ہوکر تکبیر کہتے تھے اور جب قنوت سے فارغ ہوتے تھے تو پھر تکبیر کہہ کر رکوع میں جاتے تھے۔ اس اثر میں ایک راوی لیث بن ابی سلیم ہیں جو ثقہ ہیں۔ لیکن مدلس ہیں اور ان کا مدلس ہونا روایت کے معتبر ہونے میں حارج نہیں ہے۔ کیوں کہ امام مسلمؒ جیسے شدید شرائط والے محدث نے بھی ان کی احادیث کو اپنی صحیح مسلم میں روایت کیا ہے۔ اور امام بخاری نے اس سے استشہاد بھی کیا ہے۔ لہٰذا اب یہ حدیث حسن کا درجہ میں ضرور داخل ہے اور حدیث حسن حجت ہے۔

احادیث مذکورۂ بالا میں سے نمبر ایک، دو، تین سے مرفوعاً و موقوفاً وتر میں قنوت پڑھنا ثابت ہے اور نمبر چار اثر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہٗ سے (جو معلّم الامت ہیں) قنوت وتر میں ہاتھ اٹھانا ثابت ہے اور نمبر پانچ سے قنوت کے لیے رفع یدین کے بعد تکبیر کہنا ثابت ہے۔ غرض یہ کہ مندرجۂ بالا روایات سے وتر میں قنوت پڑھنا، قنوت کے وقت ہاتھ اٹھانا، تکبیر کہنا، یہ تینوں چیزیں باسانید صحاح و حسان مرفوعاً اور موقوفاً بصراحت و وضاحت ثابت ہے۔

رہا یہ امر کہ تکبیر کہتے وقت ہاتھ اٹھانا حضورؐ سے ثابت نہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کلیہ قاعدہ ہے احناف کا کہ ہر مسئلہ میں اوّل قرآن سے حکم معلوم کیا جاوے، اگر وہاں نہ ملے تو حدیث میں دیکھا جاوے اگر حدیث میں بھی نہ ملے تو پھر صحابہؓ کا جو حضورؐ کی تعلیم کے حامل اور آپؐ کے سچّے وارثینِ علوم نبویہ تھے۔ ان کا دستور العمل دیکھا جاوے چنانچہ قرآن میں تو یہ مسئلہ بالاتفاق مذکور نہیں۔ حدیث میں کسی جگہ بوقت قنوت رفع یدین اور تکبیر کہنے کی ممانعت مذکور نہیں اور جو اس کی ممانعت کا دعویٰ کرے، اس پر لازم ہے ثبوت پیش کرے۔ اب ہم کو عملِ صحابہؓ میں قنوت پڑھنے کی کیفیت تلاش کرنی چاہیے کہ صحابہؓ کس طرح قنوت پڑھتے تھے، قنوت پڑھتے وقت تکبیر کہتے تھے یا نہیں، ہاتھ اٹھاتے تھے کہ نہیں؟ پس اس پر جب ہم نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے والے بلا تکلّف گھر میں آتے جاتے والے جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہٗ جن کے بارے میں حضورؐ کا ارشاد ہے کہ ما حدثکم ابن مسعود نصدقوہ (ابن مسعود جو کچھ بیان کریں اس کی تصدیق کرو) اور جن کو کوفہ میں محض دین کی تعلیم ہی کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ان کا عمل یہ ہے کہ وہ قنوت پڑھتے وقت رفع یدین کرکے تکبیر کہہ کر پھر قنوت پڑھتے تھے۔ لہٰذا احناف نے اس معلّم الامت رضی اللہ عنہٗ کے فعل کو اختیار کیا۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے: اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم یعنی میرے اصحاب ستاروں کے مانند ہیں، جس کی بھی اقتدا کرلوگے ہدایت پا جاؤگے۔ پس اگر احناف نے کسی مسئلہ میں جس کا جواب صاف حضور اکرمؐ سے ثابت نہ ہو، آپؐ کے صحابہؓ کی اقتدا کرلی تو کیا قصور کیا ہے کہ ان کو ہدفِ ملامت بنایا جاتا ہے۔

دوسروں کے اعمال سے کچھ بحث نہیں۔ بلکہ کہنا صرف یہ ہے کہ اس قسم کی اشتعال انگیز اعلانات وغیرہ سے اہل السنۃ والجماعۃ کو مشتعل اور اپنے مذہب میں مشکوک نہونا چاہیے۔ بلکہ اس دورِ جہالت ضلالت اور الحاد میں اپنے ثابت شدہ قدیم مسلک پر سختی کے ساتھ پابند رہنا چاہیے۔ غیر مقلد حضرات جب کسی مسئلہ پر کچھ بولیں گے یا لکھیں گے تو صرف ایک رُخ کے مطابق اور اپنے موافق حدیثیں آپ کے سامنے پیش کریں گے۔ اس کے علاوہ دیگر احادیث جو اُن کے خلاف اور ہمارے مؤید ہیں پبلک میں پیش نہیں کرتے اور اگر بضرورت کہیں ذکر بھی کرتے ہیں تو اپنی لچر تحقیقات کے مطابق اس کو ضعیف موضوع غلط بتا دیتے ہیں۔ وہ لوگ جو علم حدیث اور اسماء رجال سے واقف نہیں ہیں کسی صحیح اور ضعیف حدیث میں فرق نہیں کرسکتے۔ لہٰذا صحیح مسلک سے بھٹک جاتے ہیں۔ اس لیے عوام احناف کے لیے ضروری ہے کہ وہ یک رُخی بات پر ہرگز کان نہ دھریں اور خود اپنے علماء سے آکر اُس مسئلہ کی تحقیق کرلیں۔

واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم ۔

ناچیز ابوالناصر عُبیدی مجددی پھلتی غفرلہ ولوالدیہ

الجواب صحیح

احقر محمد شفیع عفا اللہ عنہٗ

خادم دارالعلوم دیوبند

۶؍ صفر ۱۳۶۰ھ

دار الافتاء

مدرسۂ اسلامیہ

فی دیوبند۔ الھند

۱۰؍ جون ۱۹۴۱ء

بقیہ "افتتاحیہ" (صفحہ 18 سے آگے)

اور زندگی کے ہر میدان میں مصلحانہ اور داعیانہ کردار ادا کرسکتے ہیں۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب کہ ائمہ مساجد پورے خلوص وللّٰہیت اور امّت کی خیر خواہی وہمدردی اور فلاح وبہبودی کے جذبہ کے ساتھ مسائل کی طرف توجّہ دیں اور اگر انہوں نے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تعمیر کی اور مسائل کو مصالح اور منافع کی نظر سے دیکھا تو انہیں محراب کی آغوش میں تسبیح ومناجات کے سوا کوئی چیز حاصل نہ ہوگی۔ وما علینا الا البلاغ ۔۔

حضرتِ قطبِ ویلور علیہ الرحمۃ

مجدّدِ جنوب حضرتِ قطبِ ویلور علیہ الرحمہ نے اپنے مریدین و معتقدین اور تلامذہ و خلفاء کے نام فارسی میں خطوط تحریر فرمایا ہے۔ جن میں کئی ایک موضوعات پر روشنی ڈالی ہے بعض مکتوبات کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین ہے

مترجم مولانا مولوی حافظ ڈاکٹر ابو النعمان بشیر الحق قریشی قادری لطیفی ایم اے، پی ایچ ڈی، استاد دار العلوم لطیفیہ ویلور

• مکتوب بنام مولوی امام الدین جھکری نائب قاضی بنگلور

حمد و صلوٰۃ اور سلام و دعا کے بعد واضح خاطر شریف ہو کہ

یہاں پہنچنے والوں کی زبانی معلوم ہوا کہ آنمحترم قضاؤۃ کے منصب پر فائز ہو چکے ہیں۔ جب سے آپ قاضی ہو چکے ہیں آپ کے خطوط نہیں آرہے ہیں۔ حتیٰ کہ خان صاحب ممدوح کے خطوط ہیں، سلام تک بھی نہیں ہے۔ خط و کتابت کا ذکر کیا؟ معلوم ہوتا ہے کہ قضاوت کی خدمت ہم فقیروں کی یاد اور محبت کے لیے رکاوٹ بن گئی ہے۔ اور ہم بھول کر بھی یاد نہیں آرہے ہیں۔

خلیفۂ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہر روز مغرب کی نماز کے بعد اپنے محلے والوں کی اونٹنیوں کا دودھ دوہا کرتے تھے۔ خلیفہ ہونے کے بعد بھی آپ رضی اللہ عنہ نے یہ دودھ دوہنا نہیں چھوڑا۔ تعجب کی بات ہے کہ آپ صرف قاضی بن کر ہم فقیروں کو یاد تک نہیں کر رہے ہیں۔

عزیز من!

خان صاحب ممدوح کے مکتوب میں چند امور کی نشاندہی کیا ہوں، ملاحظہ فرمائیے اور ان کو دستور العمل بنا لیجیے۔ پہلے خود کو شریعت کا پابند کر لیں۔ قضاوت اور عدالت کو شریعت کے نفاذ کا ذریعہ سمجھیں۔ اگر آپ نے ایسا نہیں

کیا تو عہدۂ قضا کو ایک بلا سمجھیے۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے روز بہت سے عزت والے ذلیل و خوار ہو جائیں گے۔ اور بہت سے لوگ جو دنیا میں ذلیل رہے عزت والے ہو جائیں گے۔ اللہ تعالے سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اور تمہیں دنیا اور دنیا کی ظاہری شان و شوکت اور چمک دمک اور زرق برق اور حسن و جمال میں گرفتار نہ کرے اور آخرت کی ابدی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں سے بھی زیادہ قریب ہے اور وہ ہماری دعاؤں کو قبول کرتا ہے۔ انہ قریب مجیب۔

اللہ تعالے حاضر و ناصر ہے تم جہاں کہیں رہو۔

• مکتوب بنام الحاج نواب مرتضیٰ خان بہادر

حمد و صلوٰۃ اور سلام و دعا کے بعد واضح خاطرِ شریف ہو کہ

عزیزی مولوی سید شاہ محمد قادری کی زبانی معلوم ہوا کہ فقیر کی سفارش قبول کرلی گئی ہے اور مسجد بھی تیار ہو چکی ہے۔

آں محترم ہم فقیروں کی جانب جو التفات کرتے ہیں اور ہماری موجودگی اور عدم موجودگی میں جن باتوں کا پاس و لحاظ رکھتے ہیں اور جس محبت و عقیدت اور ادب کا اظہار کرتے ہیں اس سے امید ہے کہ آپ کی جانب اللہ تعالے کی توجہات اور عنایات ہو جائیں گی۔

خواجہ احرار قدس سرہٗ کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ وہ شریعت کے احکام نافذ کرنے کے لیے بڑی جد و جہد کیا کرتے تھے اور ہمیشہ حاجت مندوں کی حاجت پوری کرنے میں کوشاں رہا کرتے تھے۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جس میں اسلام کو غلبہ حاصل تھا اور ضرورت و احتیاج بھی شدید نہ تھی۔ اب ایسا زمانہ ہے جس میں اسلام غربت اور اجنبیت سے دوچار ہے۔ ان حالات میں تھوڑے سے عمل پر بھی بڑا اجر و ثواب حاصل ہوگا اور اللہ تعالے کے نزدیک مقبول ہوگا۔ لہٰذا ہمارے زمانہ میں اگر کوئی عالمِ دین خلوصِ دل اور خلوصِ نیّت کے ساتھ امراء کی صحبت اختیار کرے اور ان کو حاجت مندوں کی حاجت پورا کرنے کی طرف متوجہ کردے تو یہ عظیم خدمت ہوگی اور اربابِ اقتدار سے رابطہ رکھتے ہوئے شرعی احکام کو نافذ کرادے تو اس سے بڑھ کر کوئی سعادت نہیں۔

معلوم ہوا ہے کہ نواب عظیم جاہ بہادر کو ناگور سے واپسی کے بعد لڑکی تولد ہوی ہے۔ ان ہی دنوں میں بہو بیگم صاحبہ نے مریم بی کو اولاد صالح کے استدعا کے ساتھ میرے نزدیک بھیجا تھا۔ میں نے اسم مصوّر کے اثنی نقوش اور کچھ دوائیں جو رحم اور جنین کے لیے تقویّت دینے والی اور بانجھ پن کو دُور کرنے والی ہیں دے دی ہے۔ اور استعمال کا طریقہ بھی بتلا دیا ہے۔

اس دوا کے استعمال کے دو ماہ بعد مریم بی کے ذریعہ نواب صاحب کے حمل کی بشارت ملی۔ ظاہری اسباب میں الجھ کر دُعا سے غافل نہ ہو جائیں۔

سعادت آثار!

دنیا میں ہمیشہ لوگوں کی فلاح و ترقی اور ان کا نقصان و خسران امراء اور ارباب اقتدار کے ساتھ مربوط رہا ہے۔ اُن کی خوبی کا اثر بھی دوسروں پر ہوتا ہے۔ اور اُن کی بُرائی کا اثر بھی دوسروں پر ہوتا ہے۔ ایسے اشخاص کی بڑی کمی ہے، جو عالم شباب دولت و ثروت اور اقتدار ہونے کے باوجود آخرت کو اپنی نگاہ کے سامنے رکھے رہتے ہیں۔

دولت مندی اور مال داری صحیح معنی میں دولت دینے والے کی اطاعت و بندگی میں ہے جو دولت نیکی میں صرف ہو وہی دولت مندی ہے اور جو دولت بدی میں صرف ہو وہ دولت مندی نہیں فرعونیت ہے اور دولتمند تو رعایا کی دولت ہے۔ اس کو رعایا کے کام آنا چاہیے۔

موت، موت کے بعد کی زندگی، حساب، جنت، دوزخ اور اللہ تعالے پوشیدہ اور ظاہر چیزوں کا علم رکھنے والا ہے۔ یہ سب حق ہے اور یہ اہلِ سنّت و جماعت کے عقائد میں سے ہے۔ یہ باتیں اور عقائد نواب صاحب کے ذہن نشین کیجیے۔ میں نے توحید، نبوت انبیاء اور آخرت کے اثبات پر ایک کتاب لکھی ہے۔ وہ بھیج چکا ہوں۔ مطالعہ کیجیے اور نواب صاحب ممدوح سے کہیں کہ قرآن کریم کی تفاسیر، احادیث کی شروحات اور سیرتِ طیبہ اور سیرتِ خلفاء راشدین کا مطالعہ کریں۔

نیز شیخ جمال الدین مدک کی کتاب "روضۃ الاحباب" اور امام غزالی کی تصانیف اور شیخ عبدالقادر جیلانی کے ملفوظات، شیخ شرف الدین یحیٰی منیری کے مکتوبات اور امام ربانی مجدّد الف ثانی کی "آداب الصالحین" وغیرہ کا مطالعہ کریں۔ اشیاء کی پہچان ان کے اضداد ہوتی ہے۔

علمِ حق کے نُور سے جہالت کی تاریکی اور کفر کی قباحت واضح ہوتی ہے اور خوفِ خدا سے دل معمور ہوتا ہے۔

اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے: انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء: اللہ تعالٰی سے علماء ہی خوف کھاتے ہیں۔

مرغن وچکنی چپڑی غذائیں اور رنگین ومنقش کپڑے، ظاہری شان وشوکت، مال داروں کی صحبت، حق بات کہنے میں لوگوں کی نکتہ چینی کا خوف، یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو قبر میں کام آنے والی نہیں ہیں۔ ان سے تو آخرت خراب ہوجاتی ہے۔ اور یہ سب چیزیں مومن کی جان کے لیے ایک قید خانہ ہے اور یہ اس کے حوصلہ کو پست کردیتی ہیں۔[۵]

اے سراو باغ تو زندان تو   خان ومان تو بلائے جان تو

اے انسان! یہ تیرے باغات ومکانات تیرے لیے قید خانہ ہے اور مال واسباب تیری جان کے لیے مصیبت ہے۔

نجانا اللہ وایاکم عن حب الدنیا واھلھا: اللہ مجھے اور آپ کو دنیا ومافیہا کی محبت سے بچائے رکھے۔ اللہ تعالٰی سے دعا گو ہوں کہ وہ ہمیں اور تمہیں موت اور آخرت کے احوال پر نظر رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارے قلوب کو اپنی معرفت کے نور سے روشن کردے۔ دنیا جسے دوام اور ثبات نہیں ہے اور قبر میں ساتھ آنے والی نہیں ہے، اس کی محبت سے بچائے رکھے۔ اور ہمارے دلوں کو ایمان اور عمل کی قوت سے مضبوط کردے۔ [۵]

تو مرا دل دہ دلبری ببیں   روبہ خویش خوان شیری ببیں

تم مجھے دل دے دو اور بہادری دیکھو۔ مجھے اپنی بلی ہی کہہ دو پھر بہادری دیکھو۔

وقت کاٹنے والی تیز تلوار ہے۔ اس پر قدرت کو غنیمت سمجھو۔ یعنی وقت کو کام میں لاؤ۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں رہو۔

• مکتوب بنام مرتضٰے حسین

حمد وصلوٰۃ وسلام ودعا کے بعد واضح خاطر ہو کہ تمہارا الفت نامہ مورخہ ۲۵ ذی الحجہ ۱۲۶۳ھ کو دستیاب ہوا۔ لوگوں کی زیادتی اور تیرگی اور ایذا رسانی سے بھری باتوں کا علم ہوا۔ بھائیوں کی ناموافقت اور زمانہ کی ستم ظریفی کی اطلاع ہوئی قلب مضطرب اور بے چین ہوگیا۔ نیک بخت اور سعادت مند لوگوں کو اللہ تعالٰی کے سوا دوسری چیزوں کا خیال قلب کو سیاہ اور زنگ آلود کردیتا ہے۔ اللہ تعالٰی کی یاد اور اس کا ذکر بڑی اہم چیز ہے۔ اسی کے ذکر سے دل صیقل ہوتا ہے اور اس کی ساری تاریکی دور ہوجاتی ہے۔ لہٰذا تمہیں چاہیے کہ ہر حال میں اللہ تعالٰی کی جانب مائل اور متوجہ رہیں۔ اللہ تعالٰی نے اپنے فضل وکرم سے ساری مخلوق کی روزی کی

ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے۔ اس کا فرمان ہے: وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا:
زمین پر جو بھی جان دار ہے ہر ایک کا رزق اللہ تعالیٰ پر ہے۔

اسی ربِّ کریم نے ماں کے پیٹ میں ناف کے ذریعہ بچّہ کے لیے رزق کا انتظام کیا۔ پھر پیدا ہونے کے بعد ماں کے سینے سے بغیر کسی طلب کے پرورش فرمائی اور اس کے بعد کسب کی قوت اور توفیق بھی بخشی تاکہ وہ اب جدوجہد کے ذریعہ رزق حاصل کرے۔ اب خاموش ہاتھ پر ہاتھ دھر نہ بیٹھے۔

اللہ تعالیٰ کا دسترخوان عام ہے۔ حضرت سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

ادیم زمین سفرۂ عام اوست　　　　بریں خوان یغما چہ دشمن چہ دوست

روئے زمین اس کا عام دسترخوان ہے۔ اس بخشش کے دسترخوان پر مومن اور کافر سب برابر ہیں:۔

عزیزمن! تمہیں یاد رکھنا چاہیے یہ دُنیا مومن کے لیے ایک قید خانہ ہے۔ اسے دُنیا میں ایسے رہنا ہے، جیساکہ وہ بیت الخلاء میں رہتا ہے۔ اس مقام پر گئے بغیر بھی چارہ نہیں۔ جس کی وجہ سے بڑی کراہت کے ساتھ جانا ہوتا ہے۔ نہ کہ خوشی اور رغبت کے ساتھ اور وہاں اتنی ہی دیر رکتا اور ٹھہرتا ہے جتنی دیر ضرورت ہوتی ہے۔ جوں ہی حاجت پوری ہوگئی، فوراً وہاں سے نکل کھڑا ہوجاتا ہے۔ اسی طرح قلبی کیفیت دُنیا کے تعلق سے ہونی چاہیے۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کئی کئی دن تک کھاتے پیتے نہیں تھے۔ بھوک کی شدّت بڑھ جاتی تو اپنے پیٹ پر پتھر باندھتے تھے۔ جو ایک خاص قسم کا پتھر تھا۔ جس کی ٹھنڈک کی وجہ سے بھوک کی شدّت میں کمی واقع ہو جاتی تھی اور سکون حاصل ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم خرما کے چند دانے کھالیا کرتے تھے۔ جس کو دَقَل کہتے ہیں۔ اور آپؐ پر کبھی ایسا وقت بھی آجاتا تھا، جس میں بھوک مٹانے کے لیے کیکر کے پتّیوں کو کھالیا کرتے تھے۔ اور کئی کئی دن ایسے بھی گزر جاتے تھے کہ آپؐ کے مکان میں چولھا نہیں جلتا تھا۔ اور رات کے وقت خانۂ نبویؐ میں اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ چراغ روشن کرنے کے لیے تیل نہیں رہتا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ عالم اسلام کے خلیفہ تھے۔ لیکن اپنی خلافت کے زمانہ میں مدینۂ منورہ میں اینٹ تیار کرتے اور اس کو فروخت کرکے اپنا اور اپنی بیوی بچّوں کا گذارا کرتے تھے۔ حضرت اویس قرنی جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں موجود تھے، لیکن بارگاہِ نبوت میں حاضر نہ ہو سکے تابعی کہلاے اور اپنے زہد و تقوےٰ اور علم کی وجہ سے خیر التابعین کہلاے اپنے پر دُنیا کے تمام دروازے بند کر لیے تھے۔ آپؒ کی حالت کو دیکھ کر لوگ

دیوانہ کہتے تھے ۔ ایک سال دو سال گزر جاتے تھے ۔کوئی شخص ان کو دیکھ نہ پاتا تھا کہ کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں اور کیا کھاتے پیتے ہیں ۔ان کی غذا بالکل معمولی تھی ۔اور وہ خرما ہوتا تھا ۔لباس بالکل معمولی اور سادہ ہوتا تھا ۔ ملّا علی قاری علیہ الرحمہ جنھوں نے مشکوٰۃ کی شرح لکھی اور "مسیح الازہر" اور "حزب الاعظم" جیسی کتابیں لکھیں مکۂ معظمہ میں جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور فروخت کرتے تھے ۔اور اسی پر گزر بسر کرتے تھے ۔جو انتہائی افلاس کا کام ہے ۔

محبِ من ! یہ حقیقت ذہن میں رکھو، فاقہ مومن کے لیے راحت ہے ۔جس رات میں فاقہ آتا ہے وہ رات اللہ والوں کے لیے شبِ معراج ہوا کرتی ہے ۔جو شخص خوب سیر ہو کر نماز کے لیے کھڑا ہوجاتا ہے تو شیطان اس کے بغل میں ہوتا ہے اور فاقہ کی حالت میں نماز کے لیے کھڑا رہتا ہے تو شیطان اس کے قریب نہیں پہنچتا ۔

اللہ تعالےٰ سے امید ہے کہ وہ ہمیں اور تمہیں دُنیا کے پراگندہ تعلقات اور جلد ختم ہونے والی لذّتوں اور روغن و شیریں غذاؤں اور رنگین و منقّش کپڑوں اور عزت و شہرت کی طلب اور امیروں کی صحبت اور ان سے منفعت کی خواہش سے بچائے رکھے گا۔جو آخرت میں کام آنے والی چیزیں نہیں ہیں ۔ اور اللہ تعالےٰ اپنی محبت سے ہمارے دلوں کو معمور کرے گا ۔ موت کی یاد اور آخرت کے ذکر سے غافل نہیں رکھے گا ۔

اصل کام تو یہی ہے باقی سب فضول ۔اللہ تعالےٰ کی حمایت و نصرت تمہارے ساتھ ساتھ رہے ، تم جہاں کہیں رہو ۔ والسلام ۔

نعت شریف

ڈاکٹر حکیم افسر باشاہ افسر صبغۃ اللّٰہی : شفا ڈسپنسری ۔ گڑیاتم

دل و دماغ یہاں ہر گھڑی مدینے میں
یہ مل رہی ہے مجھے اب خوشی مدینے میں

بڑی خوشی سے ہوی حاضری مدینے میں
جمع ہیں قدسیاں اور آدمی مدینے میں

یقیناً ہم سے وہاں کے ہیں خار و خس بہتر
انھیں نصیب ہے قربِ نبیؐ مدینے میں

قدم تو قدم ہے نفس بھی لیں گے آہستہ
گزاریں سر کے بل ہم زندگی مدینے میں

نہیں ہے لطف یہ دنیا جہاں کی دولت میں
مزہ جب آئے گا ہو بندگی مدینے میں

وہاں کی قدر یہ افسر حکیم کیا جانے
جہاں فرشتوں کی صف کھڑی ہے مدینے میں

جواہر السلوک

فائدہ ۲۵ کا بقیہ

چھبیسواں فائدہ ۲۶

مترجم ڈاکٹر سید وحید اشرف الجیلانی کچھوچھوی ۔ سابق صدر شعبۂ عربی، فارسی و اردو، دانش گاہ مدراس

حضرت مجدّدِ جنوب قطبِ ویلور علیہ الرحمہ کی معرکۃ الآراء فارسی تصنیف جواہر السلوک کا مفہوم خیز ترجمہ ہدیۂ ناظرین ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہیے کہ شیخ الاسلام عبد اللہ انصاری ہروی منازل السائرین میں فرماتے ہیں کہ جنید رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ جب بندہ فروتر حال سے بلند تر کی طرف ترقی کرتا ہے اور اس حال میں ابھی وہ کمال تک نہیں پہنچتا بلکہ باقی رہتا ہے اور حال کی کامل اصلاح نہیں ہو پاتی تو جب اس حال سے اس حال تک مشرّف ہوتا ہے تو بقیہ نقصان کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ سالک کا کوئی مقام کامل نہیں ہوتا، جب تک کہ وہ اس مقام سے گزر نہیں جاتا۔ اور جب وہ اس بلند مقام سے مشرّف ہو جاتا ہے تو اس کی تمام باریکیاں اس پر واضح ہو جاتی ہیں۔ اور وہ کمال تک پہنچ جاتا ہے۔ اور شیخ عبد الرزاق کاشی 'منازل السائرین' میں لکھتے ہیں۔ کہ جنید رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے جواز کا اثبات کیا اور شیخ الاسلام ہروی نے اس کے وجوب کی تصدیق کی اور میری عمر کی قسم شیخ الاسلام ہروی حق پر ہیں۔ کیوں کہ سارے مقامات اس کے لیے فروع ہیں اور جب تک سالک اس مقام پر نہیں ٹھہرا اور اس سے مستفید نہیں ہوا تو ان فروع سے وہ محجوب رہے گا اور اصل مقام ہی اس پر غالب رہے گا اور اسی اصل مقام کا حکم چلے گا۔ جب وہ اس سے ترقی کر گیا تو اب وہ فروع پر مطلع ہوگا، جو اس کے لیے عالی مقام ہے۔ اور اس پر متصرف اور حاکم ہوگا۔ تو وہ اب ہر فرع سے واقف ہوگا اور اپنی اہلیت کے مطابق اصل مقام پر پہنچے گا۔ ابتدا میں توبہ کی اصل یہ ہے کہ معاصی کو ترک کرے اور اس سے بچے۔ اس کے بعد قول و فعل میں مباح چیزیں جو فضول ہیں ان کو بھی ترک کر دے اور نفس کو ان چیزوں کی طرف میل کرنے سے روکے اور ان تمام چیزوں کو روکے جو حق کی طرف توجّہ کرنے میں حائل ہوں۔

اور معاملات میں ہر چیز میں فاعل حقیقی کو دیکھے اور اس کے غیر کو نہ دیکھے اور دعویٰ کرنے سے اجتناب کرے اور اخلاق میں اپنے ارادے اور اپنی قوّت سے توبہ کرے۔ (یعنی نہ اس کا ارادہ ہے نہ اپنی قوت: وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ۔ قرآن کریم: مترجم۔) اور اصول میں غیر کی طرف التفات کرنے سے باز رہے اور عزم میں فتور سے باز رہے اور ادویہ میں اپنے علم کو علم حق میں محو کر دے خود کو علم سے خالی جانے۔ ؎

علم کز تو ترا نبستاند جہل از آں علم بہ بود بسیار

(حکیم سنائی: مترجم)

اور اس کی صفات کے شہود سے غفلت سے توبہ کرے۔ خواہ یہ غفلت ایک پلک جھپکنے تک ہو۔ اور اصول میں محبوب سے سکوں (دست بدهم و هیا ۱۵۱۵) اور اس کے ماسوا سے فراغت۔ یہاں تک کہ اپنے نفس سے بھی فارغ ہوجائے اور ولایات میں بغیر وجد کے آرام نہ پکڑنا اور تلوین اور کشف کے نور کے حرماں سے مکدّر نہ ہونا اور حقائق میں غیر کے مشاہدہ اور اپنی انیّت کی بقا سے بچنا اور نہایات میں بقیہ کے ظہور سے احتراز۔

اور شیخ الاسلام اسی کتاب میں فرماتے ہیں جان لو کہ ان مقامات کی سیر کرنے والے قطع امر میں اپنے اختلاف کے سبب ان کے اندر کی سیر کی ترتیب مقرر نہیں ہے اور شیخ کاشی اسی کتاب کی شرح میں لکھتے ہیں۔ کہ ان کی استعداد میں اختلاف، ان کے سلوک میں اختلاف کی مقتضی ہے۔ پس مراد کا محبوب سلوک کے اتمام کے قبل ہی جذب کو پالیتا ہے تو اس کی نہایات بدایات کے قبل ہی ہو جاتی ہے۔ اور مرید کا محب اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اور ان میں سے بعض ہیں جو بعض مقامات تک نہیں پہنچ پاتے اور ان میں سے بعض بعض مقامات پر نہیں ٹھہرتے۔ اپنی استعداد کی خصوصیت کے سبب اور ان میں سے بعض سکر اور حیرانی میں نہیں مبتلا ہوتے اپنی استعداد کی قوّت کے سبب اور ان میں سے بعض کو صحو نہیں نصیب ہوتا۔ اور اسی طرح ان کی نہایات کی ترتیب میں فرق ہوتا ہے۔ محبّ متوسّط کا حال ان کی استعداد کے درجات کے مطابق ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

شیخ الاسلام اسی کتاب میں فرماتے ہیں: جان لو کہ اس گروہ کے عام علماء اور اس طریقہ کے مشیر اس بات پر متفق ہیں کہ بدایات کی صحت کے بغیر نہایات کی تصحیح نہیں ہوسکتی۔ جس طرح کہ عمارت بنیاد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی اور بدایات کی تصحیح سے مراد اخلاص کے ساتھ شریعت کی پابندی، سُنّت کی متابعت اور نبی کی تعظیم ہے۔ خوف کے ساتھ اور حدود اللہ کی تعظیم کے ساتھ اور لوگوں پر شفقت کے ساتھ ان کو نصیحت کے ذریعہ اور ان

لوگوں سے دُور رہ کر جو وقت کو خراب کرتے ہیں اور ہر اس سبب سے دُور رہ کر جو قلب کو فتنہ میں ڈالتے ہیں۔ کیوں کہ لوگ تین۳ طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو خوف اور امید کے درمیان عمل کرتے ہیں۔ حیا کے ساتھ اللہ تعالےٰ کی طرف محبت کی نظر رکھتے ہوئے یعنی محبت کا دعوےٰ کئے بغیر۔ اس کو مرید کہتے ہیں۲ دوسرا وہ شخص جسے تفرّق کی وادی سے نکال کر جمع کی وادی میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ اور یہ وہ ہے جس کو مراد کہتے ہیں۔ اور ان دونوں کے سوا جو ہیں وہ محض مدّعی، فتنہ پرور اور فریب خوردہ ہیں۔

اور یہ تمام مقامات تین مراتب میں مجتمع ہیں۔ پہلا مرتبہ ہے سَیر کے لیے تیار ہونا۔ دوسرا مرتبہ ہے۔ مسافرت میں داخل ہونا۔ یعنی اپنی طبیعت کے وطن سے باہر آنا اور اپنے اصلی وطن کی طرف مسافرت کرنا۔ تیسرا مرتبہ ہے عینِ توحید کے مشاہدہ جاذبہ کا حصول، فنا فی اللہ ہو کر۔

چھبیسواں۲۶ فائدہ •

ولایت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ولایتِ عامّہ دوسرے ولایتِ خاصّہ۔ بعض ارباب ولایت خاصّہ میں زیادتی و کمی نہیں ہوتی اور قیامت تک ان کے قیام یکے بعد دیگرے جاری رہتا ہے۔ (مثلاً ایک وقت میں ساری دنیا میں ایک ہی ہوتا ہے۔ اس تعداد میں کمی یا زیادتی نہیں ہوتی۔ مترجم۔) اور ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ تجلّیٔ الٰہی کے ظہور و خفا کے مطابق ان میں کمی و زیادتی ہوتی رہتی ہے۔

قیصری مقدمۂ شرح قصیدۂ فارضیہ کے مقصدِ ثانی کے فصلِ ثانی میں لکھتے ہیں کہ جان لو کہ ولایت ماخوذ ہے ولی سے اور یہ قُرب ہے اور اس لیے اس کو حبیب کہتے ہیں۔ (حبیب محب و محبوب دونوں کو کہتے ہیں۔ منتخب رہین سطرفی الاصل) ولی وہ ہے جو اپنے مُحب سے قریب ہوتا ہے اور یہ حق سبحانہٗ تعالیٰ سے قُرب ہے اور یہ ولایتِ عامّہ و خاصّہ ہے۔ ولایتِ عامّہ کی طرف اس میں اشارہ ہے۔ مَنْ اٰمن باللہ وعَمل صالحاً (جو اللہ پر ایمان لایا اور عملِ صالح کیا۔) قال اللہ تعالےٰ، اللہ ان کا ولی ہے جو ایمان لائے ان کو وہ کفر کی تاریکی سے باہر نکالتا ہے نورِ ایمان کی طرف۔ اور ولایتِ خاصہ فنا فی اللہ ہونا ہے مِن حیث ذات وصفت وفعل۔ پس ولی وہ ہے جو فنا فی اللہ ہو جو ظاہر ہیں اُس کے اسماء و صفات سے قائم ہے اور یہ ولایت دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک عطائی دوسرے کسبی۔ عطائی وہ ہے، جو مجاہدہ کے قبل ہی حضرت رحمانیہ کی طرف انجذاب کے ذریعہ حاصل ہو جاتی ہے اور کسبی وہ ہے، جو مجاہدہ کے بعد

انجذاب کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ جس کا جذبہ مجاہدہ پر سبقت لے گیا۔ اس کو محب کہتے ہیں۔ حق سبحانہٗ کی طرف اس کے تقرب کے سبب۔ صورتِ اول میں پہلے ہی انجذاب حاصل ہوتا ہے۔ صورتِ ثانی میں جیسا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب سے نقل کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ بندہ نوافل کے ذریعہ ترقی کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اُسے محبوب بنالیتا ہوں۔ الخ حدیث۔

جو جذبہ محبت تابجہ پر موقوف ہے اُسے کسبی کہتے ہیں اور یہ تقرب حق سبحانہٗ کی طرف سے بطریقِ باطن بندہ کے ازلی استعداد کے سبب ہوتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو کسی کے لیے بھی حظوظ نفسانی سے باہر نکلنا ممکن نہ ہو اور محبوب کمال میں محب سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ اس لیے قطبیت کے مقام پر صرف محبوب ہی پہنچتے ہیں اور قطبیت کے مرتبۂ اولیٰ تک صرف ایک آدمی پہنچتا ہے۔ جسے غوث کہتے ہیں اور مخلوق کے احوال میں اُن کا مغیث ہوتا ہے۔ اس کے بعد امامین ہوتے ہیں۔ ان کی حیثیت سلطان کے وزیر کی ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک صاحب الیمین ہوتا ہے۔ جو غوث کی اجازت سے عالمِ ملکوت اور عالمِ غیب میں تصرّف کرتا ہے۔ دوسرا صاحب الیسار ہوتا ہے جو عالمِ ملک والشہادۃ میں تصرّف کرتا ہے غوث کی اجازت سے۔

قطب کے ارتحال کے بعد صاحب الیسار کو اس کا مقام ملتا ہے۔ اس طرح سَیر اور وجود کا دائرہ پورا ہوتا ہے۔ اس کے بعد چار نجبا ہوتے ہیں۔ اس کے بعد سات ابدال ہیں جو اقالیم سبعہ کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک ایک اقلیم کا قطب ہوتا ہے۔ اس کے بعد دس اولیاء کا مرتبہ ہے۔ اس کے بعد بارہ ۱۲ حاکم ہیں' بارہ بروج پر۔ اس کے بعد بیس ۲۰ اور چالیس ۴۰ اور ننانوے ۹۹ اسمائے حسنیٰ کے مظاہر ہیں، تین سو ساٹھ ۳۶۰ تک۔ اور یہ عالم میں قائم ہیں۔ بدل کے طور پر (یعنی اگر کوئی فوت ہوتا ہے تو اس کی جگہ دوسرا لے لیتا ہے۔ اس طرح تعداد میں فرق نہیں پڑتا۔ مترجم) ان کی تعداد میں نہ زیادتی ہوتی ہے نہ کمی قیامت تک۔ ان کے علاوہ جو اولیاء ہیں' ان میں تجلّی الٰہی کے ظہور و خفا کے مطابق کمی و زیادتی ہوتی رہتی ہے۔ اس کے بعد زہاد، عباد، صلحاء کے مراتب ہیں۔ جو قیامت تک ہوتے رہیں گے۔ اور یہ سب قطب کے حکم میں داخل ہیں۔ (یعنی اُن پر قطب کا حکم چلتا ہے۔ مترجم) کامل لوگوں میں سے وہ افراد جو مرتبہ میں قطب کے برابر ہیں' سوا اس کے کہ ایک کے بعد ان میں سے کوئی ان کی جگہ نہیں لیتا' وہ اس حکم سے خارج ہیں)۔ کیوں کہ وہ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ سے معانی و اسرار الٰہیہ براہِ راست پاتے ہیں۔ جن کو اللہ نے ایسا بنایا ہے۔ کہ اُن پر شیطان کا غلبہ نہیں ہو سکتا۔ وہ نبی صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مقامِ عرفان سے واصل ہیں۔

مجتہد و حافظ احادیث نبویؐ شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنے رسالہ "الخبر الدّال علی وجودِ النقباء والاقطاب والاوتاد والابدال" مستند احادیث نبویؐ کی روشنی میں اعداد اولیاء کا ذکر کیا ہے۔ جو ہر زمانہ میں قیامت تک رہتے رہیں گے۔ جن اولیاء کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کی اسناد وہاں دیکھنا چاہیے۔

اس کے بعد جاننا چاہیے کہ قیصری ولی کی تعریف میں 'مقدمہ شرح فصوص الحکم ابن عربی' میں لکھتے ہیں ولی وہ ہے جو فنافی اللہ ہے اور اسی کے ساتھ باقی ہے۔ فنا سے مراد یہ نہیں ہے کہ بندہ مطلقاً معدوم ہو جاتا ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ بشریت کی جہت ربانیت کی جہد میں فنا ہو جاتی ہے۔ (یعنی تخلقوا باخلاق اللہ کے بمصداق اس کے اندر صفات الٰہیہ پیدا ہو جاتی ہیں۔ مترجم) اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ حق سبحانہٗ تعالےٰ میں بندہ کی توجہ تام نہ ہو۔ تو جب تقویٰ کی اس منزل تک پہنچ جاتا ہے تو اس کی خلقی عادت پر حقیقت غالب آجاتی ہے اور اسے اصالتہً فنا کر دیتی ہے۔ مثلاً انگلی سے آگ کے شعلہ کو کاٹ دینا۔ یہ اس طرح کہ انگلی میں آگ کو قبول کرنے کی جو استعداد چھپی ہوئی ہے وہ رفتہ رفتہ مشتعل ہو کر اس میں آگ کی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے تو اس سے وہی حاصل ہوتا ہے جو آگ سے حاصل ہوتا ہے۔ یعنی جلانا اور روشن کرنا وغیرہ۔ اشتعال سے پہلے انگلی سرد تاریک تھی اور یہ فنا واجب ہے چونکہ موت کے بعد پھر زندگی ہے۔ کیوں کہ بندہ حقّانی تعیّنات اور ربّانی صفات سے دوبارہ متعین ہوگا۔ اور یہی بقا یا لحق ہے۔ اس لیے متعیّن کی صفت اس سے مطلقاً مرتفع نہیں ہوتی۔

قیصری اسی کتاب میں یہ بھی لکھتے ہیں:

ولایت کی ابتدا اس پہلے سفر کی انتہا ہے جو خلق سے حق کی طرف کی جاتی ہے۔ اغیار و مظاہر سے محبت و تعلق کے ازالہ کے ذریعہ اور قیود سے خلاصی پاکر اور منازل و مقامات کو عبور کر کے اور مراتب و درجات کے حصول کے ذریعہ۔

قیصری اس میں یہ بھی لکھتے ہیں: یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ یہ فنا فناءِ علمی ہے جو عارفین کو حاصل ہوتی ہے اور یہ کہ عارفین ارباب شہود میں نہیں ہیں اور وہ عین اس حالت میں نہیں ہیں جو فنا و بقا میں ہوتی ہے۔ جیسا کہ بعض عارفین نے یہ گمان کیا ہے۔ اپنے علم توحید کے سبب۔ بے شک محبت کے علم اور محبت کی حالت میں عظیم فرق ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے: ؎

لا یعرف الحبَّ اِلّامَنْ یُکابرہ ولا الصّبابۃَ اِلّامَنْ یُعانیھا

وہ محبت کو نہیں جانتا جس کو اس کا تجربہ نہیں ہے۔ وہ غم کو نہیں جانتا جس نے رنج اٹھایا نہیں ہے۔

نقوشِ طاہر

علماء کی شان اور اُن کے تاریخی فیصلے

حضرت اقدس مولانا ابوالحسن صدرالدین سیّد شاہ محمد طاہر قادری رحمۃ اللہ علیہ

علم ایک فضلِ خداوندی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ جس کو اپنا برگزیدہ بنالیتا ہے، وہی اس لازوال دولت کو حاصل کر کے بلند مرتبہ پر فائز ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب بھی کسی انسان کو علم کے نور سے شرح صدر حاصل ہوتا ہے تو وہ صاحبِ بصیرت و فراست ہوجاتا ہے۔ اتقو بفراست المؤمن اس کی شان ہوتی ہے۔ اور وہ عالمِ ربّانی جیسے جلیل القدر لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ حق و صداقت کے علم بردار حضرات علماءِ کرام نے حصولِ علم کے لیے ہزارہا میل کا سفر طے کیا اور بے مثال قربانیاں دیں۔

حضرت علی ابنِ عاصم اپنے وقت کے ایک زبردست عالم اور صاحبِ کمال انسان، ابھی آپ کم سن ہی تھے کہ حصولِ علم کے لیے ایک طویل سفر کرنا چاہا۔ آپ کے والدِ بزرگوار نے فرزندِ دلبند کے نیک اور صالح ارادے سے واقف ہوکر ایک لاکھ درہم جیسی خطیر رقم دیتے ہوئے فرمایا: لختِ جگر! یہ ایک لاکھ درہم لے لیں اور طلبِ علم میں صرف کرو۔ مگر اتنا ضرور یاد رہے کہ جب تم میرے سامنے آؤ تو اس کے عوض تمہارے سینے میں ایک لاکھ حدیثیں محفوظ ہونی چاہئیے۔ ہونہار فرزندِ ارجمند نے بڑی ہی جانفشانی اور عرق ریزی سے دولتِ علم حاصل کیا اور ایک لاکھ سے زیادہ حدیثیں یاد کرلیں۔ اس طرح اپنے والدِ بزرگوار کی تمنّا اور آرزو کو پورا کیا اور اپنی محدثانہ و عالمانہ کمالات کی بدولت دنیائے اسلام سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ نیز "مسند العراق" کے لقب سے مشہور زمانہ ہوئے۔

ہشام بن عبداللہ محدّث کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ نے علمِ حدیث کی تحصیل کے لیے ایک طویل سفر اختیار کیا۔ جیّد علماء سے علمِ حدیث کی تحصیل کے دوران سات لاکھ درہم خرچ کئے۔ غرض علمائے سلف نے علمِ دین کی طلب و جستجو میں عظیم پیمانہ پر مالی قربانیاں دے کر ایسی مثالیں قائم کر دیں کہ آج بھی اُن کے پاکیزہ تذکروں کا چرچا پوری آن بان کے ساتھ ہو رہا ہے۔ علمِ دین کی بدولت علماء کی شان نرالی اور مثالی

ہوتی ہے۔ اُن کی عظمت و رفعت و ہیبت و جلالت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وقت کے سلاطین و فرمانروا بھی اُن کے آگے سرنگوں ہوجاتے ہیں۔ اور ان کی دعاؤں کے متمنّی ہوتے ہیں۔

چنانچہ خلیفہ ہارون رشید نے ایک مرتبہ ایک نابینا عالم کو کھانے پر مدعو کیا۔ طعامِ ماحضر سے فراغت کے بعد خلیفہ نے خود آگے بڑھ کر لوٹا اٹھاتے ہوئے اُن کے دونوں ہاتھوں کو دُھلایا۔ پھر اُن سے پوچھا کہ کس نے آپ کے ہاتھ دُھلائے؟ عالم صاحب نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس پر خلیفہ نے کہا: اس شرف کا حاصل کرنے والا میں ہی ہوں۔ ان کلمات کو سن کر انھوں نے دعائیں دیں۔ خلیفہ نے کہا کہ انھیں دعاؤں کے لیے میں نے آپ کے ہاتھ دھلائے تھے۔

مولانا عبد العلی علیہ الرحمہ لکھنؤ کے ایک جیّد عالم و فاضل بزرگ تھے جو بحر العلوم کے لقب سے ہندوستان بھر میں مشہور ہوئے۔ آپ کی جلالتِ علمی کا شہرہ سُن کر محمد علی والاجاہ، نواب آف آرکاٹ نے آپ کو مدراس آنے کی دعوت دی جس کو قبول کرتے ہوئے آپ شہر مدراس پہنچے۔ جب آپ کی پالکی محل کے صدر دروازے پر رکھی گئی اور آپ نے اترنا چاہا تو نواب صاحب نے آپ کو اشارے سے روک دیا اور خود پالکی کو کندھا دیتے ہوئے محل کے اندر لے آئے اور آپ کی بے حد تعظیم و تکریم کی۔

علمائے کرام کی بے پناہ علمی صلاحیتوں کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اپنی فکر اور تدبّر سے امّتِ محمّدیہ کے سینکڑوں مسائل کو حل کر کے رکھ دیا۔

حضرت امام شافعی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ میں ایک رات حضرت امام محمد (شاگرد حضرت امام اعظمؒ) کا مہمان تھا۔ کھانے پینے سے فراغت کے بعد وہ بستر پر لیٹ گئے اور میں نماز میں مشغول ہوگیا۔ اور رات بھر نمازیں پڑھتا رہا جب صبح ہوئی تو امام محمد اٹھے۔ وضو کئے بغیر سنّت ادا کرنے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے متعجب ہو کر اُن سے دریافت کیا کہ آپ تو رات بھر سوتے رہے اور وضو کئے بغیر آپ نے سنّت ادا کی ہے؟ آخر ماجرا کیا ہے؟ امام محمد نے جواب دیا: کہ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں رات بھر سوتا رہا ہوں! نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ بلکہ میں نے پوری رات قرآن مجید سے استنباط کرتے ہوئے ایک ہزار سے زیادہ مسائل حل کئے ہیں۔ آپ نے جو ساری رات نمازیں پڑھیں اس کا فائدہ صرف آپ کی ذات کی حد تک محدود رہے گا۔ اس کے برخلاف میں نے جو عملِ خیر کیا ہے اس کا فائدہ امّتِ محمّدیہ کو پہنچتا رہے گا۔ مجھے لیٹ کر سوچنے اور مسائل حل کرنے میں سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے یہی بات تھی کہ میں رات بھر لیٹا رہا اور غور و خوض کرتا رہا۔

علمائے کرام کی روحانی طاقت ہی اور بصیرت ہی تھی کہ انھوں نے پیچیدہ اور مشکل مقدموں کے انوکھے انداز میں دانشمندانہ فیصلے کرکے ایک عالم کو انگشت بدندان کر دیا۔

امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی خلافت کا دَور تھا۔ ایک پریشان حال نوجوان آپ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: یا امیر المؤمنین! میرے اور میری والدہ کے درمیان فیصلہ کیجیے کہ اس نے نو مہینوں تک مجھے اپنے شکم میں رکھا، میری پیدائش کے بعد دو سال تک دودھ پلایا اور جوان ہونے تک میری پرورش کی اب وہ میرے فرزند ہونے کا انکار کر رہی ہے۔ مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ کہتی ہے کہ میں تجھے جانتی ہی نہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس کی ماں کا پتہ دریافت کرکے طلب کیا۔ وہ عورت اس کے چار بھائی نیز چالیس گواہ آپ کے دربار میں حاضر ہوئے۔ آپ نے اس عورت سے دریافت کیا کہ یہ تیرا لڑکا ہے؟ عورت نے قسم کھاکر کہا: میں اس کو جانتی ہوں نہ پہچانتی ہوں۔ پھر اس عورت کے بھائیوں سے استفسار کیا تو وہ بھی قسمیں کھاکر کہنے لگے کہ ہم اس کو بالکل نہیں جانتے کہ کون ہے؟ جب ہماری بہن کی شادی ہی نہیں ہوی بھلا یہ بچّہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس پر مزید طُرّہ یہ کہ چالیس گواہوں نے بھی قسمیں کھاکر بیان دیا کہ اس عورت کی اب تک شادی ہی نہیں ہوی ہے تو بچّہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اگر اس نوجوان کے بھی گواہ ہوتے تو ان متضاد بیانات کی وجہ فیصلہ ناممکن تھا۔ امیر المؤمنین نے معاملہ کی گہرائی تک پہنچتے ہوے اس عورت، اس کے بھائیوں اور چالیس گواہوں سے دریافت کیا: میں جو بھی فیصلہ کروں گا، کیا تمہیں منظور ہے۔ تمام نے ایک زبان ہوکر کہا: ہاں آپ جو بھی فیصلہ دیں گے ہمیں منظور ہے۔

آپ نے فرمایا: میں خدائے تعالیٰ اور ان حاضرین کو گواہ رکھ کر یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ اس عورت کا نکاح اس نوجوان سے کردیا جائے۔ پھر نوجوان کی طرف متوجّہ ہوکر کہا: تم کہیں سے چار سو درہم فراہم کرلو۔ اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ پھر آپ نے اس نوجوان سے کہا کہ ان چار سو درہموں کو اس عورت کی گود میں ڈال دو۔ اس کے عوض میں اس عورت کا نکاح تمہارے ساتھ کرنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا کل صبح تم اس عورت کے ساتھ دربار میں حاضر ہونا یہ سُن کر وہ عورت گھبرا اٹھی اور چلّاتی ہوی کہنے لگی: اے امیر المومنین! یہ میرا ہی لختِ جگر ہے۔ میرے بھائیوں نے کسی کمینے سے میرا نکاح کردیا تھا۔ جس سے یہ لڑکا پیدا ہوا۔ اس کے جوان ہونے کے بعد میرے بھائیوں نے مجھ سے کہا کہ اس کی فرزندی سے دست بردار ہوجاؤں اور گھر سے نکال دوں۔ اس لیے میں نے ایسا کیا۔ اس عورت کی تمام گفتگو سننے کے بعد آپ نے اس کو حکم دیا کہ اپنے بیٹے کو ساتھ لے جائے اور اپنے ساتھ رکھے۔

یہ روحانی طاقت اور بصیرت ہی کا فیض تھا کہ آپ نے ایسا کامیاب فیصلہ صادر کیا کہ حقیقت عیاں ہوکر رہ گئی۔ آپ ہی کا ایک اور نادر فیصلہ ملاحظہ فرمائیے :

دو آدمی کہیں سفر کرتے ہوئے جارہے تھے۔ جب دوپہر ہوئی تو دونوں نے ایک درخت کے سایہ میں پناہ لی۔ کھانے کے لیے توشہ کھولا۔ اتنے میں ایک تیسرا شخص بھی چلا آیا۔ ایک کے نزدیک تین روٹیاں اور دوسرے کے نزدیک پانچ روٹیاں تھیں۔ ان آٹھ روٹیوں کو تینوں نے مساوی طور پر تناول کیا۔ کھانے سے فراغت کے بعد نووارد شخص نے جاتے ہوئے پانچ روٹیوں والے کے ہاتھ میں آٹھ درہم دے کر کہا: آپس میں برابر تقسیم کرلیں۔ پانچ روٹیوں والے نے اپنے لیے پانچ درہم الگ کرکے تین روٹیوں والے کو تین درہم دینا چاہا۔ اس شخص نے لینے سے انکار کرتے ہوئے جھگڑا شروع کیا اور کہا: ہم لوگ تو مساوی طور پر کھائے ہیں۔ لہٰذا درہم بھی مساوی طور پر تقسیم ہونا چاہیے۔ جھگڑا طول پکڑتا گیا۔ یہ دونوں امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کے دربار میں پہنچے۔ آپ نے فریقین کے بیانات سماعت فرمانے کے بعد فرمایا: اے شخص! جب وہ تجھے تین دینا ہو تو قبول کرلے۔ ورنہ تیرے حصّہ میں ایک ہی درہم آئے گا۔ اس پر اس شخص نے کہا: کہ جب ہم مساوی طور پر روٹی کھائے ہیں تو میرے حصّے میں ایک درہم کیسے آسکتا ہے؟ اگر آپ مجھے سمجھادیں تو میں ایک ہی درہم لے لوں گا۔ آپ نے فہمائش کرتے ہوئے کہا: اگر آدمیوں میں تیری تین روٹیوں کو تین سے ضرب دی جائے تو تیری تین روٹیوں کے نو حصّے ہوتے ہیں جس سے آٹھ حصّے تو نے کھائے اور ایک حصّہ اس نے کھایا۔ اور پانچ روٹیوں کو تین سے ضرب دیں تو پندرہ حصّے ہوتے ہیں۔ پندرہ حصوں میں آٹھ حصّے تو خود کھایا اور سات حصّے اپنے مہمان کو دیا۔ اس حساب سے سات درہم اس کو ملیں گے اور ایک درہم تجھ کو ملے گا۔ وہ اس عجیب وغریب فیصلہ کو سن کر حیران ہوگیا اور ایک ہی درہم پر اکتفا کرلیا۔

غرض علمائے ربّانیین کی شان ہی کچھ نرالی ہوتی ہے۔ وہ کسی بھی چیز کو اپنی بصیرت کے نور سے دیکھ کر اس کی حقیقت کو بیان کردیتے ہیں اور اس کی روشنی میں پیچیدہ اور مشکل ترین مسائل کا حل تلاش کرلیتے ہیں۔ یہ علمی جواہرات کے خزانے آپ تک پہنچ رہے ہیں۔ ان سے پوری طرح استفادہ کریں۔ علامہ اقبالؒ نے کیا ہی خوب فرمایا ہے : ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے

کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین ٭٭
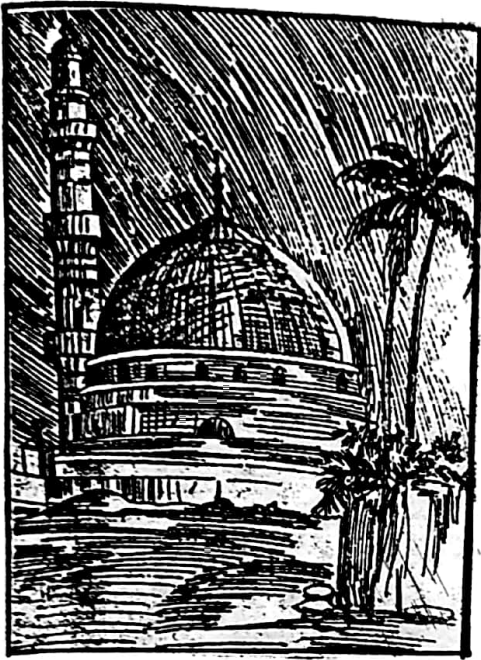
خطابِ دلپذیر

۱۲ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ روز جمعرات حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے یوم پیدائش کی نسبت سے ایک جلسہ زیر صدارت عالی جناب حضرت مولانا ڈاکٹر سید شاہ عثمان قادری مدظلہ العالی، ناظم دارالعلوم لطیفیہ، ویلور منعقد ہوا۔ جس میں دارالعلوم لطیفیہ کے اساتذہ کرام، طلباء عزیز اور دیگر اسلامی درسگاہوں کے اساتذۂ کرام اور طلبۃ العلوم اور عصری درس گاہوں کے اساتذہ وطلبا، مقامی وبیرونی حضرات علماء ومشائخ عظام، شہر ویلور اور اس کے گرد ونواح کے رؤسا وعمائدین اور عوام الناس کی خاصی تعداد شریک رہی۔ اس موقعہ پر حضرت مولانا ڈاکٹر مولوی حافظ ابو النعمان بشیر الحق ایم اے، پی ایچ ڈی نے نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت وشخصیت سے متعلق پُر از معلومات خطاب کیا۔ جس کی تلخیص قارئینِ "اللطیف" کی خدمت میں پیش ہے۔

ادارہ

الحمد للہ کفیٰ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علی النبی الذی لا نبی بعدہ اما بعد فقد قال اللہ تعالیٰ فی شانِ حبیبہ فالذین اٰمنوا بہ وعزروہ ونصروہ الاٰیۃ

"جو لوگ اُن پر (محمد ﷺ) ایمان لائے اور جنہوں نے ان کی تعظیم کی، جنہوں نے اُن کی نصرت کی اور جنہوں نے قرآن کریم کی اتباع کی وہی کامران اور شادکام قرار پائیں گے۔"

صدرِ محترم ومکرم! حضرات سامعینِ کرام!

ذات رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم سے متعلق علامہ اقبال کے جذبات واحساسات ملاحظہ فرمائیے:

وہ دانائے سبل، مولائے کل ختم رسل جس نے غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسین وہی طٰہٰ

آج ربیع الاوّل کی بارہویں تاریخ ہے اور یہ وہی تاریخ ہے جس میں آفتابِ ہدایت طلوع ہوا۔ جس کی ضیا پاش کرنوں سے سارا جہاں منوّر ہوگیا۔ اور یہ بھی عجیب و غریب بات ہے کہ اسی ماہ، اسی تاریخ میں یہ سورج غروب ہوا۔ دنیا میں کسی کی آمد باعثِ مسرور ہونے میں دو رائے نہیں ہے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی آمد تو سارے عالم کے لیے خیر ہی خیر، برکت ہی برکت اور رحمت ہی رحمت ہے تو پھر ایسی صورت میں یہ دن دنیائے انسانیت کے لیے کیوں کر سرور کا باعث نہ ہوگا۔ اور ایسی عظیم ترین نعمت حاصل ہونے پر شرعی حد میں رہتے ہوئے اظہارِ سرور کیا جائے تو بھلے سے وہ بدعت ہی سہی لیکن تحدیثِ نعمت اور اظہارِ شکر کی ایک مستحب شکل اور مندوب صورت ہے۔ اور ایسے اعمال کے استحباب اور جواز کے لیے شریعتِ مطہرہ میں کئی ایک مثالیں اور نظیریں موجود ہیں۔

ممکن ہے یہ تفصیل سُن کر بعض سامعینِ کرام کے ذہنوں میں یہ خیال ابھرنے لگا ہو کہ ۱۲ ربیع الاول تو حضور اکرمؐ کی وفات شریف کا بھی دن ہے۔ بھلا یومِ ارتحال میں مسرت کا اظہار کیسے درست ہو سکتا ہے؟

معزز حضرات!

اس میں شک نہیں ارتحال اور انتقال دنیاوی اعتبار سے ایک ناپسندیدہ اور غیر محمود مرحلہ ہے، لیکن یہ بات آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ گرامی پر منطبق نہیں ہو سکتی۔ جس طرح آپؐ کی حیات شریف خیر ہے اسی طرح آپ کی وفات شریف بھی خیر ہے۔ جس کا اظہار خود زبانِ نبوت نے فرمایا: حیاتی خیر لکم ومماتی خیر لکم۔

میری زندگی تمہارے لیے خیر ہے اور میری وفات بھی تمہارے لیے خیر ہے۔ بعد از وفات تمہارے اعمال مجھ پر پیش ہوتے رہیں گے۔ اگر وہ نیک ہوں تو میں اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کروں گا اور اگر نیک نہ ہوں تو میں تمہارے لیے استغفار کرونگا۔ ایک امتی کے لیے نبی کا استغفار حاصل ہونا ایک ایسا خیر ہے کہ اس سے بڑھ کر خیر اور کیا ہو سکتا ہے۔ نبیٔ کریم کا استغفار صرف اُن مسلمانوں تک محدود اور مخصوص رہے جو آپؐ کی حیات میں موجود تھے اور آپؐ کی وفات کے بعد دین میں داخل ہونے والے افراد کو استغفار حاصل نہ ہو تو یہ بات شانِ رحمۃ للعالمین کے منافی ہوگی۔ اس لیے آپؐ کا استغفار قیامت تک دینِ حنیف میں شامل ہونے والے افراد کو حاصل ہے اور ہر امتی کے اعمال آپؐ کی روحِ مطہرہ پر پیش ہوتے ہیں۔

الغرض! حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کا دِن حضرات صحابہؓ کے لیے حزن و ملال اور رنج و غم کا دِن

ضرور تھا۔لیکن یہی دن تا قیامِ قیامت ہر مومن کے حق میں استغفارِ نبویؐ کے آغاز کا سبب بن گیا۔

دُنیا کی یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ خاتم الانبیا رسیدنا حضور پرنور محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلم انسانیت کا کامل ترین نمونہ تھے۔ آپؐ کی نظیر اور مثیل نہ آپؐ سے پہلے تھی اور نہ آپؐ کے بعد قیامت تک ممکن ہے۔ بھلا ایسی بے مثال شخصیت کی عظمت و فضیلت اور شرف و بزرگی اور مدح و ثنا کسی شخص کی زبان و قلم سے کیا ہو سکتی ہے۔ جس کی شانِ بے نظیر میں خالقِ کائنات ہی نے یہ کہہ دیا ہو: لولاک لما خلقت الافلاک: آپؐ نہ ہوتے تو یہ دنیا ہی نہ ہوتی اسی لیے عقل و خرد، نطق و گویائی اور قلب و ضمیر نے یہ کہہ کر اپنے لیے سلامتی کی راہ متعین کر لی: ؎

لا یمکن الثناء کما کان حقہٗ　　　بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

غالبؔ نے بڑی حق پسندانہ بات کہی: ؎

غالبؔ ثنائے خواجہ بیزداں بگذاشتیم!　　　کہ آن ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

اے غالبؔ! نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مدح اور ثنا کا معاملہ خدا پر چھوڑ دو کیونکہ وہی محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ جانتا ہے۔ یہ تمہارے بس کی بات نہیں۔

امام بوصیری نے اپنے قصیدہ میں کہا: ؏　　　دع ما ادعتہ النصاری فی نبیھم

آمدم برسرِ مطلب!

معزز حضرات!

تقریر کے آغاز میں جو آیتِ کریمہ تلاوت کی گئی تھی وہی آج کے اس خطاب کا موضوع ہے۔ اس آیت میں چار چیزیں ہیں۔ پہلی چیز حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا، دوسری چیز آپؐ کی تعظیم و توقیر اور احترام کرنا اور تیسری چیز آپؐ کی نصرت و حمایت کرنا اور چوتھی چیز قرآن کریم کی اتباع و پیروی کرنا۔

ان میں پہلی چیز حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا۔ ایمان کے دو رُخ ہیں: ایک خارجی اور دوسرا داخلی۔ اس کا خارجی رُخ یہ ہے کہ آدمی اپنی زبان سے اس بات کا اقرار کرے کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم اللہ تعالےٰ کے رسول ہیں۔ اقرار باللسان۔

اور اس کا داخلی رُخ ہے تصدیق بالقلب اور وہ یہ ہے کہ اس زبانی اقرار کی تصدیق دل سے ہو اور اس بات پہ کامل یقین ہو اور اگر کسی نے صرف زبان سے اقرار کیا، دل سے تصدیق نہیں کیا تو یہ صاحب ایمان نہ ہوگا۔

جیسا کہ عہدِ نبوت میں بعض لوگوں نے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا صرف زبان سے اقرار کیا تھا۔ لیکن ان کے دل تصدیق اور یقین سے خالی تھے۔ ایسے لوگوں کے لیے اسلام نے ایک خاص اصطلاح وضع کی ہے۔ اور وہ لوگ منافقین کے نام سے موسوم کئے گئے۔

ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دل کی گہرائیوں سے والہانہ اور مخلصانہ محبت کی جائے۔ اور یہی عشق و محبت اور الفت و مؤدت ہی ایمان کی اصل اور اس کا کمال ہے اور اسی محبت کی وجہ سے عزت و احترام اور تعظیم و تکریم کے جذبات اُبھرتے ہیں اور اسی عظمت و محبت سے دلوں کے اندر جذبۂ طاعت اُبھرتا ہے۔

حضرات صحابہؓ کی فضیلت و عظمت اور شرف و بزرگی کا انحصار اسی محبتِ رسولؐ پر تھا۔ قرآن کا بیان ہے النبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسھم : یہ وہ نبی ہیں جو اہلِ ایمان کے نزدیک اُن کی جانوں سے زیادہ محبوب ہیں

محترم حضرات!

رسول کی محبت ہی ایمان ہے اور یہ کوئی مبالغہ آمیز بات نہیں اور یہ کوئی غالیانہ عقیدہ نہیں ہے۔ یہ اعتقاد تو ایک حدیث سے مستنبط ہے: والذی نفسی بیدہ لایؤمن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ من نفسہ : اس ذات کی قسم! جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے۔ تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک مومن ہو نہیں سکتا جب تک کہ میں اُس کے نزدیک اُس کی جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

ایک اور حدیث میں یہاں تک صراحت ہے کہ مومن کے دل میں نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت اس کی ذات، اس کی اولاد، اس کے والدین اور سارے لوگوں سے بڑھ کر ہونی چاہیئے۔ لایومن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تو آنحضرت صلعم نے اُن سے پوچھا: اے عمرؓ! کیا تم مجھے چاہتے ہو؟ حضرت عمرؓ نے عرض کیا، ہاں! یا رسول اللہ! میں آپؐ کو محبوب رکھتا ہوں۔ یہ سن کر آنحضورؐ نے پھر اُن سے پوچھا: کیا مجھے اپنے مال و دولت سے بھی زیادہ چاہتے ہو؟ حضرت عمرؓ نے عرض کیا: ہاں! یا رسولؐ اللہ! یہ دولت کیا چیز ہے، یہ تو آپؐ کا صدقہ ہے۔ پھر حضور اکرمؐ نے حضرت عمرؓ سے کہا: اے عمرؓ! کیا تم مجھے اپنی اولاد سے بھی بڑھ کر چاہتے ہو؟ عرض کیا: ہاں! ہاں! یا رسول اللہ۔ اس

کے بعد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ، اے عمر! کیا تم مجھے اپنی جان سے بھی بڑھ کر چاہتے ہو؟ اس سوال پر حضرت عمرؓ فوراً جواب نہ دے سکے ۔ تو آنحضرتؐ نے اپنا دستِ مبارک اُن کے سینہ پر رکھا اور وہ فوراً پکار اٹھے والذی بعثک بالحق انت احب الی من نفسی الآن یارسول اللہ! اب آپؐ میرے نزدیک میری جان سے بھی زیادہ عزیز ہو چکے ہیں ۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اسی غایت درجہ محبت کا نتیجہ تھا کہ حضرات صحابہؓ نے اپنی جانوں کو اور اپنے مالوں کو اور اپنے جگر کے ٹکڑوں کو آپؐ پر نچھاور اور نثار کر دیا ۔ ولو بالفرض ان حضرات کے قلوب میں محبتِ رسولؐ کی شمع فروزاں نہ ہوتی تو کیا یہ قربانیاں، فداکاریاں اور جانِ نثاریاں جلوہ نما ہوتیں ۔

معزز سامعین ! اس وقت میں آپ کے سامنے دو مثالیں پیش کروں گا :

نبیٔ کریمؐ مدینۂ طیبہ میں رونق افروز ہوے تو یہاں کے مسلمانوں نے جو جانی اور مالی قربانیاں پیش کیں، جس کی مثال حضرات انبیاء اور مصلحین کی تاریخ میں نہیں ملتی ۔

آنحضرت کو جب یہ اطلاع ملی کہ کفارِ مکہ، مدینۂ منورہ پر حملہ کرنے والے ہیں تو آپؐ نے تمام مسلمانوں کو جمع کیا اور اُن کے سامنے جنگ کے خدشات اور امکانات کو بیان کیا اور فرمایا : اگر جنگ چھڑ گئی تو کیا تم میرا ساتھ دو گے ؟

یہ سُن کر مکہ مکرمہ سے آنے والے مسلمانوں نے تعاون کا یقین دلایا ۔ نبیٔ کریمؐ نے پھر یہی سوال دہرایا ۔ تو مدینۂ منورہ کے مسلمانوں کو احساس ہوا ، شاید نبیٔ کریمؐ جنگ کے مسئلہ میں ہماری یقین دہانی کے منتظر ہیں ۔ چناں چہ حضرت سعدؓ مجلس میں اٹھ کھڑے ہوے اور آپؐ سے مخاطب ہو کر فرمایا :

یارسول اللہ ! لانقول کما قال قوم موسیٰ فاذھب انت وربک فقاتلا انا ھٰھنا قاعدون ولکن نقاتل عن یمینک وشمالک وبین یدیک وخلفک ۔

اللہ کے رسولؐ ! ہم یہودیوں کی طرح نہیں ہیں کہ آپؐ کو یہ جواب دیں گے ، جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے انھیں قوم عمالقہ سے جہاد کرنے کے لیے کہا تھا تو انھوں نے یہ جواب دیا : اے موسیٰ ! آپ اور آپ کا رب جائیے اور مقابلہ کیجیے ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے ۔

لیکن اللہ کے رسول ! ہم آپؐ کے آگے ، پیچھے ، دائیں ، بائیں چاروں طرف سے مقابلہ کریں گے ۔ اگر

حضور ہمیں سمندر میں بھی کودنے کا حکم دیں تو ہم آپؐ کی خاطر اپنی جانوں کو ہلاک کر دیں گے۔
چنانچہ وقت آنے پر حضرت سعدؓ اور اُن کے قبیلے کے تمام لوگ اور مدینۂ منورہ کے مسلمان اور تمام مہاجرین اپنی جانوں کو ہتھیلیوں پر لیے ہوئے میدان جنگ میں کود پڑے اور آپؐ کا بھرپور ساتھ دیا اور کفار کو شکست فاش دی
اسی طرح جب بھی مالی قربانی کی ضرورت پڑی تو ان حضرات نے نبئ کریمؐ کی محبت میں اپنا سب کچھ لٹا دیا۔
چنانچہ غزوۂ تبوک کے موقعہ پر ان بزرگوں نے مال واسباب اور دولت کے ڈھیر نبیؐ کے قدموں میں ڈال دیا حضرت ابو بکرؓ نے تو اپنے گھر کا سارا اثاثہ لاکر نبیؐ کی نذر کر دیا تو حیرت سے آپؐ نے پوچھا: اے ابو بکر! اپنے بال بچوں کے لیے بھی کچھ چھوڑا ہے یا نہیں؟ عرض کیا: ان کے لیے خدا کا رسولؐ کافی ہے۔ ؎

پروانے کو چراغ تو بلبل کو پھول بس — صدّیق کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس

محترم سامعین!
نبئ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کی تعظیم وتکریم اور احترام واکرام کا پورا پورا خیال اور لحاظ رکھنا چاہیے اور اس پہلو سے ذرا سی بھی غفلت نہیں ہونی چاہیے۔ ہمارے بزرگوں نے آپؐ کی مرقد شریف کے سامنے بھی تعظیم کا وہی انداز اختیار کیا اور وہی پہلو برقرار رکھا جو آپؐ کی حیاتِ ظاہری میں رکھا جاتا تھا۔ ؎

ادب گاہ ایست زیر آسماں از عرش نازک تر — نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

اگر کسی نے بھی آپؐ کی تحقیر وتوہین کا ادنیٰ سا تصوّر بھی کیا تو اس کے قلب سے ایمان کی روشنی سلب ہو جائے گی۔
قرآنِ کریم نے آپؐ سے مخاطب ہونے کے انداز واطوار اور طور وطریقوں تک کی نشاندھی کی اور ایسے عامیانہ وسوقیانہ یا ذو معنی الفاظ استعمال کرنے سے پرہیز کرنے کا حکم دیا۔ جن کے اندر توہین وتذلیل کا پہلو پایا جاتا ہو۔ چنانچہ حضرات صحابہ کو راعنا کہہ کر آپؐ سے خطاب کرنے کو روکا گیا۔ اس لفظ کا ایک سیدھا سادا اور عام فہم مفہوم تو یہ تھا کہ اے خدا کے رسولؐ! ہماری رعایت فرمائیے۔ اس سے ان حضرات کا منشا یہ تھا کہ آپؐ اپنی بات کی مزید وضاحت فرمائیے، تاکہ ہم اچھی طرح سمجھ سکیں۔ لیکن اس لفظ راعنا کا ایک معنوی رشتہ رعونت سے بھی جڑا ہوا ہے جس کے معنی ہیں بے وقوف اور احمق! حالاں کہ اس لفظ کے ذریعہ کسی صحابی کے قلب وذہن میں بھی نبئ کریمؐ کی معمولی سی تحقیر کا معمولی سا تصوّر بھی نہ تھا۔ حاشا وکلا۔ لیکن یہودیوں نے اس لفظ راعنا سے یہی مفہوم (احمق اور بیوقوف) اپنے پیشِ نظر رکھا اور اپنے ذہنوں اور دلوں میں بسائے ہوئے حقارت آمیز خیالات واحساسات کے ساتھ حضور اکرمؐ

سے مخاطب ہونے لگے : راعنا یا محمدؐ۔

یعلم ما فی الصدور والی ذات جل جلالہ کو اپنے نبی کی یہ مخفی توہین کب برداشت ہو سکتی تھی۔ چنانچہ حضرت جبرئیلؑ حکمِ خداوندی لیے ہوئے بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہوئے اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ جب بھی حضور اکرمؐ سے خطاب کریں تو انظرنا کہیں۔ یعنی نگاہِ کرم فرمائیے۔ توجہ کریمانہ فرمائیے اور اس لفظ کا استعمال ہی بند کردیں جس میں نبی کی تحقیر کا پہلو یہودیوں کے ذہنوں میں موجود ہے : لا تقولوا راعنا۔

قرآنِ کریم نے ایک مقام پر یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر کسی کی آواز نبیؐ کے سامنے بلند ہو جائے تو اُس کی نیکیاں برباد اور گناہ لازم آجائے گا۔ لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبیؐ : اپنی آوازوں کو نبی کریمؐ کی آواز پر بلند ہونے نہ دو۔ اس آیت کے نزول سے تعلق مفسرِ قرآن ابنِ عباسؓ نے لکھا ہے کہ یہ آیت کریمہ صحابیٔ رسولؐ حضرت ثابت بن قیس کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کے بعد وہ بارگاہ نبویؐ میں حاضر نہیں ہوئے۔ کچھ دن گزرنے کے نبیٔ کریمؐ نے انھیں یاد کیا۔ اور حضرت سعدؓ سے پوچھا کہ وہ کس حال میں ہیں۔ اور اُن کے حاضر نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟ یہ سُن کر حضرت سعدؓ نے عرض کیا : یا رسولؐ اللہ! وہ میرے پڑوسی ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ تندرست ہی ہیں۔ کہ آپؐ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکیں۔

اس کے بعد حضرت سعدؓ ان کے گھر پہنچے اور بارگاہِ نبوت میں ان کی غیر حاضر رہنے کا سبب پوچھا اور حضور اکرم کی یاد فرمائی کا تذکرہ کیا تو حضرت ثابتؓ نے فرمایا : میں تو جہنمی ہو گیا۔ میری آواز تو کافی بلند ہے۔ اور آیتِ طیبہ کا جو حکم ہے وہ آپ واقف ہی ہیں۔ اس گفتگو کے بعد حضرت سعدؓ نبیٔ کریم کی خدمت میں پہنچے اور حقیقتِ حال کو آپؐ کے سامنے بیان کیا۔ یہ سُن کر نبیٔ کریمؐ نے فرمایا : جاؤ! ابن قیس سے کہو کہ وہ جنتی ہیں۔ اب تک جو ہوا وہ معاف ہے۔

حضرات صحابہؓ پر اس واقعہ کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ اس کے بعد وہ حضور اکرمؐ سے بات چیت کرتے تھے تو آواز اس قدر دھیمی رہتی تھی کہ آپؐ پر اُن کا مدعا واضح نہیں ہوتا تھا، جس کی وجہ سے آپؐ کو دوبارہ پوچھنے کی نوبت آتی تھی۔

حضور اکرمؐ کے ساتھ حضرات صحابہؓ کے ادب و احترام کا کیا عالم تھا اس کی ایک ہلکی سی جھلک عروہ بن مسعود ثقفی کے آنکھوں دیکھا حال میں ملتی ہے۔ جب کہ وہ صلح حدیبیہ کے موقعہ پر قریش کے سفیر بن کر بارگاہِ

رسالت میں آ پہنچے تھے۔ ان کا یہ بیان شہادتِ عینی کا درجہ رکھتا ہے۔ اور یہ اس وقت کا بیان ہے جب کہ وہ کفار و مشرکین کی صف میں شامل تھے۔ الفضل ما شهدت به الاعداء کے مصداق ان کی بات کے سچ ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں۔

چنانچہ دربارِ رسالت سے واپس ہونے کے بعد انھوں اکابرِ قریش اور قوم کے سرداروں کے سامنے علی الاعلان کہا خدا کی قسم! مجھے قیصر و کسریٰ اور نجاشی جیسے عظیم ترین اور صاحبِ شوکت اور ذی حشم بادشاہوں سے ملنے کا فخر حاصل ہے۔ لیکن کبھی میں نے ایسے بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ اس کے مصاحبین اور اس کے متبعین اس کی اتنی تعظیم و تکریم کرتے ہوں، جتنی کہ محمدؐ کے اصحاب محمدؐ کی تعظیم کرتے ہیں۔

قسم بخدا! میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، جب وہ تھوکتے ہیں تو انؐ کے مصاحبین اپنے ہاتھوں میں لیتے ہیں اور اپنے جسموں اور چہروں پر مل لیتے ہیں اور جب محمدؐ وضو فرماتے ہیں تو پانی کے قطرات کو حاصل کرنے کے لیے چاروں طرف سے ٹوٹ پڑتے ہیں اور جب محمدؐ کسی کام کے لیے فرماتے ہیں تو تعمیل کے لیے دوڑ پڑتے ہیں اور جب بھی وہ کچھ ارشاد فرماتے ہیں تو سب کے سب ہمہ تن گوش رہتے ہیں اور ان کے ادب و احترام اور ان کے رعب و دبدبہ کا یہ عالم ہے کہ کوئی بھی شخص ان کے ساتھ آنکھ میں آنکھ ملا کر بات نہیں کرتا۔

محترم حضرات!

نبئ کریمؐ کے ساتھ محبت اور تعظیم کا تقاضہ ہے کہ آپؐ کی اطاعت کی جائے۔ اگر ہم صرف خوش نما اور شان دار الفاظ کے ذریعہ آپؐ کی محبت کا دم بھریں اور آپؐ کی اتباع نہ کریں تو یہ سچّی محبت نہیں۔ آپؐ کے ساتھ سچّی محبت کی علامت آپؐ کی اتباع ہے اور یہی اتباع ایمان کے کامل ہونے کی علامت ہے۔ چنانچہ حضور اکرم فرماتے ہیں: لا یؤمن احدکم حتی یکون هواه تبعا لما جئت به: تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنی مرضیات اور خواہشات کو کتاب اللہ کے تابع نہ رکھے۔

قرآن کریم نے جہاں بھی اللہ کی طاعت کا حکم دیا ہے وہاں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طاعت کا بھی حکم دیا ہے۔ وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن الله؛ یہ حکم خداوندی ہے کہ نبیؐ کی اطاعت کی جائے۔ اسی لیے ہم نے رسول کو بھیجا ہے۔

قرآنِ کریم نے ایک موقعہ پہ نبی کی اطاعت کو اللہ ہی کی اطاعت کہا ہے؛ ومن یطع الرسول فقد اطاع الله

رسالت میں آپہنچے تھے۔ ان کا یہ بیان شہادتِ عینی کا درجہ رکھتا ہے۔ اور یہ اس وقت کا بیان ہے جب کہ وہ کفار و مشرکین کی صف میں شامل تھے۔ الفضل ما شھدت بہ الاعداء کے مصداق ان کی بات کے سچ ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں۔

چنانچہ دربارِ رسالت سے واپس ہونے کے بعد انھوں اکابرِ قریش اور قوم کے سرداروں کے سامنے علی الاعلان کہا خدا کی قسم! مجھے قیصر و کسریٰ اور نجاشی جیسے عظیم ترین اور صاحبِ شوکت اور ذی حشم بادشاہوں سے ملنے کا فخر حاصل ہے۔ لیکن کبھی میں نے ایسے بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ اس کے مصاحبین اور اس کے متبعین اس کی اتنی تعظیم و تکریم کرتے ہوں، جتنی کہ محمدؐ کے اصحاب محمدؐ کی تعظیم کرتے ہیں۔

قسم بخدا! میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، جب وہ تھوکتے ہیں تو انؐ کے مصاحبین اپنے ہاتھوں میں لیتے ہیں اور اپنے جسموں اور چہروں پر مل لیتے ہیں اور جب محمدؐ وضو فرماتے ہیں تو پانی کے قطرات کو حاصل کرنے کے لیے چاروں طرف سے ٹوٹ پڑتے ہیں اور جب محمدؐ کسی کام کے لیے فرماتے ہیں تو تعمیل کے لیے دوڑ پڑتے ہیں اور جب بھی وہ کچھ ارشاد فرماتے ہیں تو سب کے سب ہمہ تن گوش رہتے ہیں اور ان کے ادب و احترام اور ان کے رعب و دبدبہ کا یہ عالم ہے کہ کوئی بھی شخص ان کے ساتھ آنکھ میں آنکھ ملا کر بات نہیں کرتا۔

محترم حضرات!

نبئ کریمؐ کے ساتھ محبت اور تعظیم کا تقاضہ ہے کہ آپؐ کی اطاعت کی جائے۔ اگر ہم صرف خوش نما اور شان دار الفاظ کے ذریعہ آپؐ کی محبت کا دم بھریں اور آپؐ کی اتباع نہ کریں تو یہ سچی محبت نہیں۔ آپؐ کے ساتھ سچی محبت کی علامت آپؐ کی اتباع ہے اور یہی اتباع ایمان کے کامل ہونے کی علامت ہے۔ چنانچہ حضور اکرم فرماتے ہیں: لایؤمن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ: تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنی مرضیات اور خواہشات کو کتاب اللہ کے تابع نہ رکھے۔

قرآن کریم نے جہاں بھی اللہ کی طاعت کا حکم دیا ہے وہاں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طاعت کا بھی حکم دیا ہے۔ وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ: یہ حکم خداوندی ہے کہ نبیؐ کی اطاعت کی جائے۔ اسی لیے ہم نے رسول کو بھیجا ہے۔

قرآنِ کریم نے ایک موقعہ پر نبی کی اطاعت کو اللہ ہی کی اطاعت کہا ہے: ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ

اس آیت سے صاف واضح ہے کہ نبی کا حکم اللہ کے حکم سے جداگانہ نہیں ہے اور وہ بھی حکم خداوندی ہی ہے۔ اس لیے کہ نبی کریم کی زبان سے وہی بات صادر ہوگی۔ جو خدا کی بھی بات ہوگی ؛ وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ[5]:

گفتہ او گفتہ اللہ بود ! گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

قرآن کریم میں ایک مقام پر یہ آیت بھی آئی ہوی ہے۔ کہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتے جب تک کہ وہ آپسی اختلافات اور باہمی تنازعات میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو حاکم تسلیم نہ کریں۔ پھر مزید یہ بات بھی کہی گئی ہے، آپ کے صادر کردہ فیصلوں کو بسر و چشم قبول کریں اور اپنے دلوں میں کسی قسم کی تنگی اور ناراضگی کو جگہ نہ دیں اور جب نبی کریم کسی معاملہ میں اپنا حکم صادر فرمادیں تو پھر لوگوں کو اپنے معاملات کا کچھ اختیار نہ ہوگا۔ اور جو کوئی اللہ اور رسول کا حکم نہ مانے تو وہ صریح گمراہی میں ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سورۃ النساء اور سورۃ الاحزاب کی یہ آیات غور کے قابل ہیں:

فلا وربك لا یومنون حتی یحکموك فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما

اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلا مبینا۔

ان آیات کا پس منظر یہ رہا کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک جھگڑے کا مقدمہ پیش ہوا اور آپؐ نے دونوں کے بیانات کا جائزہ لیا اور اپنا فیصلہ صادر فرمایا۔ فریقین میں ایک فریق اس فیصلہ سے راضی نہیں ہوا۔ اور حضرت عمرؓ کے پاس چلا آیا اور ان سے فیصلہ کا خواہاں ہوا۔ فریق ثانی جس کے حق میں نبی کریمؐ نے فیصلہ دیا تھا اس نے حضرت عمرؓ سے کہا: یہ مقدمہ نبی کریمؐ کی خدمت میں پیش ہوچکا ہے اور آپؐ نے میرے حق میں فیصلہ صادر فرمایا ہے۔ لیکن یہ شخص اس فیصلہ سے راضی نہیں ہوا اور مجھے آپؓ کے پاس کھینچ لایا ہے۔ یہ سننا ہی تھا حضرت عمرؓ نے تلوار نکالی اور اس مدعی کو قتل کردیا۔ اور اعلان کردیا جو شخص اللہ کے رسول کے فیصلہ سے راضی نہ ہو اس کے حق میں عمر کا فیصلہ یہی ہے۔

سورۃ الاحزاب کی اس آیت اذا قضی اللہ الی آخرہ کے نزول کا سبب یہ رہا کہ نبی کریمؐ نے زید بن حارثہؓ کے لیے حضرت زینب کو نکاح کا پیغام روانہ کیا۔ حضرت زینب اور ان کے گھر والوں نے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم

کے اس فیصلہ اور اقدام سے متعلق پس وپیش کیا تو یہ آیت حضرت زینبؓ بنت جحش اور ان کے بھائی عبداللہؓ بن جحش اور ان کی والدہ میمونہؓ بنت عبدالمطلب کے حق میں نازل ہوی۔ حضرت میمونہؓ حضور اکرمؐ کی حقیقی پھوپی تھیں۔

یہ حقیقت ہے کہ نبئ کریمؐ کے ساتھ غایت درجہ کا عشق ہی آپ کی اتباع و پیروی کا اصل محرک ہے۔ یہی وہ جذبۂ عشق تھا، جس کے باعث عبداللہ بن عمرؓ کی ذاتِ گرامی سے حج کے اعمال میں ایک ایسا نمونہ ظہور پذیر ہوا۔ جس کی نظیر آج مشکل ہے۔

چناں چہ حجۃ الوداع کے سفر میں نبئ کریمؐ کے ہمراہ تھے اور حضور اکرمؐ کی ایک ایک ادا اور ایک ایک حرکت اور ایک ایک عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جب آپؓ دوسری مرتبہ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اقوال واعمال کی مکمل پیروی کی۔ حتیٰ کہ روایات میں یہ بھی آیا ہوا ہے کہ حضور اکرمؐ نے سفر حج کے دوران جہاں جہاں پڑاؤ کیا اور جہاں جہاں استراحت فرمایا اور جس جس جگہ حوائجِ ضروریہ سے فارغ ہوے، عبداللہ بن عمرؓ نے وہاں وہاں پڑاؤ کیا اور استراحت فرمایا اور رفع حاجت کا التزام فرمایا۔

حالاں کہ شرعی نقطۂ نظر سے ایسے اموروافعال کی پابندی کوئی ضروری اور لازمی چیز نہ تھی۔ لیکن عشق کا تقاضہ تھا کہ محبوب کی ایک ایک ادا کو بھی محبوب رکھا جاے۔ اور ہر ہر چیز کی پابندی اپنے اوپر لازم کرلی جاے۔

محبت اور طاعت کی سند لا باریابی کو   کہ اس در پہ فلاں ابنِ فلاں دیکھا نہیں جاتا

محترم سامعین!

موجودہ زمانے میں مسلمانوں کو زوال وپستی اور ذلّت وادبار کے دلدل سے نکالنے کی مختلف تجویزیں اور کوششیں کی جارہی ہیں اور ان کے اندر دینی اسپرٹ، مذہبی بیداری اور عملی قوت پیدا کرنے کے لیے مختلف طریقوں سے جدجہد کی جارہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود خاطر خواہ نتائج سامنے نہیں آرہے ہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟ میرے ناقص خیال میں اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں نبئ کریمؐ کی محبت وعظمت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی جارہی ہے۔

جب کہ امّت کی نشاۃ ثانیہ کے لیے یہی اصل سرچشمہ ہے۔ اگر مسلمانوں کے دلوں میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پہ نثار اور فدا ہونے کا جذبہ اور جنون پیدا ہوجاے تو ان کے اندر ایک انقلاب برپا ہوجاے گا اور اسلام سے مکمل وابستگی ہوجاے گی۔ ؏

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اس سلسلہ میں اولین کوشش یہ ہونی چاہیے کہ لوگوں کے دلوں میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک کی عظمت و محبت بھر دی جائے اور ایسا ماحول اور ایک ایسی فضا پیدا کر دی جائے کہ جس کسی کی زبان پر نبی کریمؐ کا نام مبارک جاری ہو جائے تو اسی کے ساتھ اس کی زبان سے بے ساختہ آپؐ پر درود جاری ہو جائے اور جس کسی کے کان میں یہ نام مبارک پہنچ جائے تو بے ساختہ سننے والے کی زبان پر درود جاری ہو جائے اور جہاں کہیں یہ نام مبارک لکھا ہوا نظر آ جائے تو ذہن و دل اس ذاتِ گرامی کی جانب مائل ہو جائے اور زبان پہ درود جاری ہو جائے اور اس کے لیے کوئی لمبا اور طویل درود کی ضرورت نہیں صرف یہ مختصر ترین جملہ بھی کافی ہے : صلے اللہ علی محمد

نام کی تعظیم ذات کی تعظیم کا ذریعہ بن جائے گی اور یہی چیز ذاتِ گرامی کے ساتھ محبت و الفت کا ذریعہ بن جائے گی ۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ : علامہ اقبال نے سچ کہا ہے :

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

معزز حضرات !

میں اپنی تقریر ختم کرنے سے پہلے مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات کے سامنے مختصر طور پر میلاد النبیؐ کے مسئلہ کا علمی و فقہی اور تاریخی جائزہ پیش کر دوں، تاکہ اہلِ علم اور عوام کے درمیان افراط و تفریط اور تعصب و غلو کا جو ماحول آج دیکھنے میں آ رہا ہے اس کی اصلاح کے لیے آج کی اس بابرکت مجلس میں ایک حقیر طالب علمانہ کوشش ہو جائے تو شاید کہ کسی دل میں اتر جائے میری بات

اس حقیقت کے اظہار اور اعتراف میں ہمیں کوئی تامل اور تردد نہیں ہونا چاہیے کہ میلاد النبیؐ کا عمل بدعت ہے ۔ اور یہ اسلام کی ابتدائی تین صدیوں میں کسی ایک سے بھی ثابت اور منقول نہیں ہے ۔ لیکن ہمیں یہ حقیقت بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ یہ بدعت اس قبیل سے تعلق رکھتی ہے کہ اس کے قبول کرنے میں کوئی شرعی قباحت لازم نہیں آتی ۔ کیوں کہ یہ چند مستحسن امور اور مستحب اعمال پر مشتمل ہے ۔ جس میں قرآن کی تلاوت، رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر درود و صلوٰۃ ہے اور ذاتِ اقدس کے ساتھ محبت و الفت کا اظہار ہے ۔ اور اس میں فقراء و مساکین اور عوام و خواص کے لیے ضیافت طعام ہے اور ایک دوسرے سے ملاقات اور ارتباط کی شکل و صورت ہے ۔

یہی وہ فوائد و برکات ہیں جن کی وجہ سے چوتھی صدی ہجری سے لے کر آج تک بھی ساری دنیا کے مسلمان

ماہِ ربیع الاول میں میلاد النبیؐ کے موقعہ پر مجلسیں اور محفلیں آراستہ کرتے آرہے ہیں اور میلاد النبیؐ کا یہ عمل دنیا بھر کے علماء، مشائخ اور عامۃ المسلمین کا معمول رہا ہے اور ہر زمانہ اور ہر ملک کے علماء و فضلاء اور صوفیاء کا کوئی عمل ایسا ہو جس کے تعلق سے آئمہ مجتہدین میں سے کسی مجتہد کا انکار منقول نہ ہو تو یہ عمل اپنی جگہ پر ایک شرعی دلیل اور حجت کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کا صاف صاف اور سیدھا سادا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز اور کسی واقعہ کے تعلق سے قرآن و حدیث میں کوئی حکم نہ ہو اور اس کے متعلق صحابۂ کرام کی تصریحات بھی نہ ہوں تو اس چیز اور اس واقعہ کے اندر علماء اور صوفیاء کا عمل کسی مجتہد کے انکار کے بغیر ثابت ہو تو اس فعل و عمل کے موافق شرع ہونے پر حجت اور دلیل ہے اور ایسے عمل کا تعلق اجماعِ مسلمین سے ہے اور یہ بحث آپ حضرات کو اصول فقہ اور فقہ کی کتابوں میں شرح و بسط کے ساتھ مل سکتی ہے۔

اس مقام پر میں آپ حضرات کے سامنے یہ وضاحت کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اہل سنّت و جماعت کے چاروں مذاہب (مالکی، حنبلی، شافعی اور حنفی) کے علمائے متاخرین کے ہاں یہ مسئلہ بحث و نظر اور اختلاف کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ چناں چہ شیخ تاج الدین فاکہانی، جو امام مالک کے پیرو ہیں انھوں نے میلاد النبیؐ کے عمل کو بدعتِ سیئہ کہا۔

شیخ جلال الدین سیوطی جو امام ابوحنیفۃ النعمان کے مسلک کے پیرو ہیں۔ انھوں نے میلاد النبیؐ کے عمل کو بدعت حسنہ کہا اور اس موضوع پر "حسن المقصد فی عمل المولد" نامی کتاب تصنیف کی اور میلاد النبیؐ سے متعلق اہلِ علم کے جو شکوک و شبہات تھے ان کا حل فرمایا۔ اور اصلاح کا عظیم کام انجام دیا ہے۔

اور جب کسی فروعی اور جزوی مسئلہ میں اختلاف رونما ہو جائے تو ایک ہی جانب کے حق ہونے کا یقین کر لینا اور دوسرے پہلو کو باطل قرار دینا، یہ صحیح موقف نہیں ہے۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ ایک جانب کی دلیل قوی ہے اور دوسرے جانب کی دلیل ضعیف یا یہ صورت اختیار کرنا چاہیے کہ ایک جانب کا قول راجح ہے اور دوسرے جانب کا قول مرجوع ہے۔

اور اختلافی مسئلہ میں ایک دوسرے پر لعن وطعن کرنے سے بچنا چاہیے اور کسی مسئلہ کی تائید یا تردید کو اپنی ایک شناخت نہیں بنا لینا چاہیے اور ہر ایک کو اس اس کے موقف پر چھوڑ دینا چاہیے۔ اور باہمی ادب و احترام کو پوری طرح ملحوظ رکھنا چاہیے۔ توقف و احتیاط اور اعتدال و میانہ روی سارے امور کے اندر نہ صرف مستحسن و محمود بلکہ

ضروری ہے۔

یہی وہ طریقہ ہے جس کو مسلکی رواداری کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اور اسی طرز عمل کے ذریعہ اختلافی و فروعی جزوی مسائل کے اندر توازن اور اعتدال کی شان پیدا کی جاسکتی ہے۔

موجودہ زمانے میں میلادالنبیؐ کے مسئلہ پہ بین الاقوامی و ملکی اور تہذیبی و ثقافتی حیثیت سے بھی نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اور اس کے افادی پہلوؤں کی جانب توجّہ دینے کی ضرورت ہے اور اس کے متعلق سے جو جائز تقاضے ہیں اُن سے صرفِ نگاہ کرتے ہوے بدعت کہ کر رد نہیں کیا جاسکتا۔ کتنی بدعات ایسی ہیں جن کے اندر کوئی خرابی نہ ہو تو اس کا اختیار کرنا نہ صرف مستحسن بلکہ ضروری سمجھا گیا ہے۔ جیسے نماز تراویح، جمعہ کی اذانِ ثانی مساجد کی آرائش، مدارس کی تعمیر وغیرہ۔

موجودہ دور میں میلادالنبیؐ کی مجالس کے ذریعہ قرآن وسیرتِ محمدیؐ کے پیغام کو عام کرنے اور دیگر اقوام کو اسلام کی جانب مدعو کرنے کا ایک مفید اور بہترین ذریعہ ہے۔ اور اس میں امّتِ مسلمہ کی اصلاح اور تعمیر کا وسیع میدان ہے بھلا ایسے مفید علمی و دینی اور اصلاحی و دعوتی اور تعمیری عمل کو محض تعصب کی بنیاد پہ انکار اور تردید کے درپے ہو جانا یقیناً یہ اقدام تشدّد اور افراط کی علامت ہے۔ اگر میلاد کے عنوان سے مجالس اور محافل بدعت کے دائرہ میں آجائیں تو دین کے عنوان سے منعقد کئے جانے والے تمام اجتماعات اور حلقات بھی بدعت کے دائرہ میں شامل ہو سکتے ہیں۔ ہاں البتہ اس مسئلہ میں اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ میلادالنبیؐ کا عمل اور طریقۂ کار سیاسی رہنماؤں اور دیگر مذہبی لیڈروں کے جنم دن کی شکل اور تشابہ اختیار نہ کر جاے۔ اور اس عمل میں غیر شرعی افعال اور کتاب و سنّت سے متصادم افعال کو جگہ نہیں ملنی چاہیے تاکہ یہ امور وحرکات و سکنات ہمیں اللہ کے فضل اور اتباعِ سنّت کی برکتوں سے محروم نہ کردیں۔ وما علینا الا البلاغ المبین۔ واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین •

قولِ فاطمہؓ

۱۔ ایمان اور حیا کا چولی دامن کا ساتھ ہے، جس عورت میں حیا باقی نہیں، اس کا ایمان بھی سلامت نہیں۔

۲۔ قناعت وہ سرمایہ ہے جو کبھی کم نہیں ہوتا۔

۳۔ عورتوں کے لئے کپڑوں کا دھونا غم و غصے کو کم کردیتا ہے۔

۵۔ مجھ پر ایسے مصائب پڑے ہیں کہ اگر دن پر پڑجاتے تو وہ رات کی طرح سیاہ ہو جاتا۔

حدیث

- علم تیرا نگہبان ہے، اور تو مال کا نگہبان۔
- نماز دعاؤں کے قبول ہونے کا ذریعہ ہے۔
- نماز دین کا ستون ہے اور مسلمان کا نور۔
- جنت سخاوت کرنے والوں کا گھر ہے۔
- بات کرنے سے پہلے سلام کرو۔
- لوگوں کے گناہ اکثر زبان سے سرزد ہوتے ہیں۔
- عذابِ قبر عموماً پیشاب کی بے احتیاطی سے ہوتا ہے

سید شاہ عبد الجبار قادری رحمۃ اللہ علیہ

ڈاکٹر مولانا ابو محمد سید شاہ محمد عثمان قادری ایم اے، پی ایچ ڈی؛ ناظم دار العلوم لطیفیہ۔ ویلور

اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کے خلفائے اجل میں حضرت علامہ شیخ التفسیر سید العلماء ابو السعید سید شاہ عبد الجبار صاحب قادری باقوی مرحوم و مغفور کا نام نامی سر فہرست ہے۔ آپ سادات نیشاپور کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے مورث اعلیٰ سید شاہ محمود قادری نیشاپور سے ہجرت فرما کر ہندوستان کے صوبہ آندھرا پردیش کے شہر کڈپہ کے قریب ایک شہر بدوٹور میں مقیم ہوئے۔ آپ کے جدّ امجد مولانا سید شاہ کمال الدین قادریؒ خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ آپ کا مزار شریف بدوٹور میں مرجع خواص و عوام ہے۔ آپ کے والد ماجد حضرت مولانا سید شاہ بابا فخر الدین قادریؒ ایک ولی صفت متوکل علی اللہ اور اہل صوفیاء میں سے تھے۔ حضرت شاہ صاحب قبلہ کی وفات بھی شہر بدوٹور میں ہوئی اور اپنے مخصوص قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔

حضرت مولانا سید شاہ عبد الجبار صاحب قبلہ اسی شہر بدوٹور میں ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوئے۔ اپنی ابتدائی تعلیم پدر بزرگوار سے حاصل کی۔ پھر آپ نے اعلیٰ تعلیم کے لیے جنوبی ہند کی مشہور و معروف دینی درس گاہ جامعہ باقیات صالحات ویلور میں داخل ہوگئے۔ جہاں آپ مکمل گیارہ سال تک جیّد اساتذۂ کرام سے اکتساب علم کیا۔ پھر بتاریخ ۲۰ مئی ۱۹۵۸ء میں فراغت و دستار فضیلت سے سرفراز ہوئے۔ آپ چوں کہ زمانۂ طالب علمی میں ہی اپنے حسن اخلاق و اوصاف اور ذکاوت و فراست کی وجہ سے اپنے مشفق اساتذہ کی توجہات خاص کے مرکز بنے رہے۔ لہٰذا فراغت کے فوری بعد آپ کو اپنے مادر علمی میں خدمت تدریس کا موقعۂ زرّین عطا کیا گیا۔ آپ نے تقریباً چالیس سال تک منصب تدریس کو زینت بخشی

ابتدائے عمر ہی سے آپ میں سلیقہ، فکر اور حسن انتظام بدرجۂ اتم پائے جاتے تھے۔ اسی لیے جامعہ باقیات صالحات کی مجلس شوریٰ نے باتفاق رائے آپ کو ماہ فروری ۱۹۷۵ء میں کرسی نظامت پر متمکن کردیا۔ آپ اس عہدۂ جلیلہ پر مکمل چودہ سال فائز رہے۔ بعد ۱۹۸۹ء میں حسن خدمت پر وظیفہ یاب ہوئے۔

آپ کے دورِ نظامت میں مدرسہ کی خوب شہرت ہوی ۔ مدرسۂ باقیات کے تعلقات و روابط دیگر مدارسِ عربیہ کے ساتھ کافی مضبوط و مستحکم ہوے ۔ طلبۃ العلوم میں نظم و نسق، پابندئ اسباق کی عادت فروغ پائی ۔ آپ کے حسنِ تدبیر کے کئی واقعات مشہور ہیں جن کے ذکر کا یہاں موقعہ نہیں ہے ۔

آپ انتہائی کریم النفس اور رقیق القلب واقع ہوئے تھے ۔ آپ کی بظاہر سختی مدرسہ کے مفاد پر مشتمل تھی ۔ کسی طالبِ علم کی نازیبا حرکت اس کا کھانا موقوف کر دیتے تو آپ کو اس وقت تک سکون میسر نہ ہوتا تھا جب تک کہ اس کا کھانا جاری نہ ہو جاتا تھا ۔ آپ نے طلبۃ العلوم کی اخلاقی قدروں کو بڑھانے میں اور انھیں بنانے اور سنوارنے میں اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا ۔ آپ مدرسہ باقیات صالحات سے سبکدوش ہو کر شہر کڈپہ (آندھرا پردیش) میں جامعۃ العلوم الثنائیہ کی نظامت سنبھالی تھی جس کی داغ بیل آپ ہی کے دستِ مبارک سے پڑی تھی ۔ آپ ہمہ وقت اسی فکر میں رہتے تھے کہ طلبۃ العلوم کو علم و عمل سے بہرہ مند کرنے اور انھیں اخلاقِ کریمانہ سے آراستہ و پیراستہ کرنے کے لیے عصرِ حاضر میں کون سے طریقۂ کار اختیار کیے جائیں ۔

اعلحضرت سجادہ نشینِ مکان قطبؒ ویلور سے ۲۸ فروری ۱۹۷۷ء کو آپ نے بیعت بھی کی اور خرقۂ خلافت اور عطائے جبہ و دستار سے سرفرازی حاصل کی ۔ آپ کو شیخ التفسیر کا شرف حاصل ہے ۔ تفسیرِ قرآن مجید آپ کا موضوع خاص تھا ۔ آیاتِ قرآنی کی روح کو اجاگر کرنے اور مطالبِ قرآن کو جاہل و عاصی تک کے ذہن نشین کرانے میں آپ کو ملکہ حاصل تھا ۔ چناں چہ ادارۂ صفیۂ مدرسۂ باقیات صالحات نے آپ کی تفسیری تقاریر کا مجموعہ "مضامینِ تفسیر" کے نام سے ۱۹۸۲ء میں شائع کیا تھا ۔

آپ کے طالبِ علمی کے زمانہ میں شعر و شاعری سے دلی لگاؤ تھا ۔ آپ نے موزوں طبیعت پائی تھی ۔ شعر کہنے اور صلاح و مشورہ کے لیے علامہ محوی صدیقی لکھنوی سے رجوع ہوے ۔ آپ کا بیان ہے کہ :

ایک مرتبہ کسی مشاعرہ میں شرکت کی ۔ وہاں شعراء کرام کی آپس کی رقابت سے اس قدر بددل ہوے کہ اس کے بعد کلام لکھنا اور مشاعروں میں جانا ترک کر دیا ۔ آپ کے دو شعر بطور نمونہ پیش کیے جا رہے ہیں : ۵

- نوخیز شباب اُن کا چھوٹی سی کہانی تھی   بے درد زمانے نے افسانہ بنا ڈالا
- ارتعاشِ شعلۂ برق جہندہ زندگی   خطرۂ فرزندہ و سحاب تہندہ زندگی

آپ اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں پر ملکہ رکھتے تھے۔ "حقیقتِ الفاظ" کے عنوان سے آپ کے تحقیقی مضامین ملک کے مقتدر رسائل وجرائد کی زینت بنے ہیں۔ جن میں "معیارادب" لکھنؤ، سالنامہ "صفیر" ویلور، "نفیـــہ" ویلور، ماہنامہ "سلسبیل" بنگلور قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کی کئی گرامی قدر تصانیف منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ جن میں "جانِ پدر"، "مضامینِ تفسیر"، "تفسیرِ اُمّ الکتاب"، "اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ"، "فقہی اختلاف"، میلادالنبی صلے اللہ علیہ وسلم کافی مشہور ہوئے ہیں۔

مذکورہ کتابوں کے علاوہ "پاکیزہ حکایات"، "نکاح اور مبادیاتِ نکاح" اور "مضامینِ سیرت" بھی شائع ہوئے ہیں۔ آپ ۱۹۸۸ء میں معہ اہلیہ زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوچکے ہیں۔

آپ علامۂ وقت عالِم باعمل اور صوفی بزرگ تھے۔ آپ کی ذات اقدس سے سینکڑوں تشنگانِ علم فیضیاب وسیراب ہوچکے ہیں۔

ویلور سے جدائی کے بعد بھی آپ کا تعلق اہلِ ویلور سے قائم رہا۔ آپ مسلسل ویلور آیا جایا کرتے تھے۔ اس شہر سے قلبی کا اثر تھا کہ آپ نے اسی خاک پر ۲۲ رجون ۲۰۰۳ء کو آخری سانس لی اور آخری سفر پر روانہ ہوگئے۔ آپ کی تدفین کڈپہ میں عمل میں آئی۔

آپ علم وفضل اور تقویٰ وطہارت اور حسنِ اخلاق سے آراستہ تھے اور ایک جہاں آپ کی صاف گوئی اور خوش خلقی کا معترف ہے۔ اللہ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنّت نصیب فرمائے۔ آمین!

بجاہِ سید المرسلینؐ۔ ••

مدحِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم

اقبال سہیل علیگ

کتابِ فطرت کے سرورق پر جو نام احمد صلے اللہ علیہ وسلم رقم نہ ہوتا

تو نقشِ ہستی اُبھر نہ سکتا وجودِ لوح وقلم نہ ہوتا

تیرے غلاموں میں بھی نمایاں جو تیرا عکسِ کرم نہ ہوتا

تو بارگاہِ ازل سے تیری خطاب خیر الامم نہ ہوتا

نہ روئے حق سے نقاب اُٹھتا نہ ظلمتوں کا حجاب اُٹھتا

فروغ بخشِ نگاہِ عرفاں اگر چراغِ حرم نہ ہوتا

پیشکش: سید احمد تنجاوری

علم اور فن بہت ہی معروف اور مشہور لفظ ہیں۔ علم کا معنی ہے جاننا، دانش اور فن کا معنی ہے ہنر۔ ان کی جمع ہے علوم و فنون۔

علوم اور فنون کے اقسام اور انواع کی کوئی حد نہیں ہے۔ دنیا میں ہزاروں علوم و فنون پیدا ہوئے اور ختم ہوئے آج بھی بے شمار علوم و فنون موجود ہیں۔ شاید وہ بھی ختم ہو جائیں گے اور نئے علوم ان کی جگہ لے لیں گے جو ابھی تک وجود میں نہیں آئے ہیں۔ علوم و فنون کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری رہے گا۔

علوم و فنون کی عمریں مختصر بھی ہوتی ہیں اور طویل بھی، مفید بھی ہوتے ہیں اور مضر بھی ہوتے ہیں، اور انسانوں کی طرح ان کی بھی موت واقع ہوتی ہے۔ لیکن ایک علم اور فن ایسا بھی ہے جس کی پیدائش اس وقت ہوئی جب کہ انسان پیدا ہوا۔ وہ آج بھی زندہ ہے اور اس کی موت اس وقت واقع ہوگی جب کہ بنی نوع انسان کی موت ہوگی اور وہ علم و فن انسان کی صحت اور عدم صحت سے متعلق ہے۔ اگر انسان صحت مند ہے تو اس کی صحت کیسے برقرار رکھی جائے اور اگر صحت گر چکی ہے تو اس کی صحت کیسے واپس لائی جائے! اسی علم و فن کا نام ہے **علمِ طب** یعنی صحت کی حفاظت کا علم اور اس کا طریقۂ کار۔

انسان کی زندگی ہزاروں سال سے رواں دواں ہے۔ اس زندگی کو مختلف غذا، مختلف آب و ہوا اور مختلف موسموں کا سامنا رہا ہے اور آئندہ بھی اسی طرح سامنا رہے گا۔ اسی مختلف و متنوع اور متبدل و متغیر صورتِ حال کے باعث صحت کی حفاظت اور مرض کے ازالہ کی کئی ایک صورتیں متعین ہوئیں۔ پھر کچھ معدوم ہوئیں، کچھ تغیرات کے ساتھ برقرار رہ گئیں۔ ممکن ہے کہ وہ بھی معدوم ہو جائیں اور پھر کچھ نئی صورتیں وجود میں آجائیں۔ لیکن حفاظتِ صحت اور ازالۂ مرض یہ دو چیزیں بنیادی حیثیت سے ہمیشہ باقی رہیں گی۔

بنی آدم کے جد حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اسماء کا علم عطا فرمایا: وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ کُلَّهَا

اسماء سے مراد اشیاء کے نام اور اُن کے خواص اور فوائد کا علم ہے۔ جو اللہ نے القاء اور الہام کے ذریعہ حضرت آدم علیہ السلام کو سیکھلا دیا تھا۔ ان اشیاء اور مسمات میں طب بھی شامل تھا۔ کیوں کہ زندگی ہر آن اور ہر لمحہ صحت اور عدمِ صحت سے دوچار رہتی ہے۔ اس لیے حضرت آدم علیہ السلام کو طب کی تعلیم وہبی طور پر عطا کی گئی۔

علوم و فنون الہامی اور قدرتی طور پر وجود میں آتے ہیں۔ اور پھر انسان کی طرف سے ان کے لیے قواعدُ ضوابط مرتب ہوتے ہیں۔ پھر ان کی تدوین اور جمع کا علم شروع ہوتا ہے۔ یہاں سے ان کی علمی و فنی حیثیت متعین ہو جاتی ہے۔ اور وہ شہرت پا جاتے ہیں۔

جیسا کہ علم فقہ کو لیجیے۔ اس کی بنیاد عہدِ نبوت میں پڑ چکی تھی اور اس کے اجزا اور حصے عہدِ صحابہؓ میں پھیل چکے تھے۔ عہدِ تابعین میں حضرت ابوحنیفۃ النعمان نے اس علم کے موجود اور منتشر اجزا کو جمع کیا اور اصول و قواعد منضبط کیا اور فقہ کی تدوین کی۔ اس کے بعد ہی وہ ایک مستقل فن کی حیثیت سے شہرت پا گیا اور امام ابوحنیفۃ النعمان کو بانی اور مؤسس ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔

علمِ طب کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ پیش آیا۔ سب سے پہلے علمِ طب کو اسقلبوس نے یونان میں ایک ضابطہ کے ساتھ استعمال کیا اور قاعدہ و قانون کی روشنی میں علاج کیا تو دنیا نے اسی حکیم کو علمِ طب کا بانی اور موجد قرار دیا۔ اسقلبوس کے بعد افلاطون اور فیثاغورث نے طب کی دنیا میں بڑی شہرت پائی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پانچ سو سال پہلے بقراط نے طب کے اصول منضبط کیا۔ اور اس بعد ارسطاطالیس نے قواعد کلیہ کو قلم بند کیا اور دیثوفوریدوس نے ادویہ کا علم مرتب اور مدون کیے اور حکیم جالینوس نے اعضاء کے منافع وغیرہ کی تفصیل اور تشریح کی۔ علمِ طب کو مصر، چین، یونان اور ہندوستان کے اندر فروغ حاصل ہوا۔ پھر وہ دنیا کے سارے ملکوں میں پھیل گیا۔ اور وہ اپنی فیض رسانی اور شفاء بخشی کے باعث لوگوں میں مقبول ہوتا چلا گیا۔

اسلام کی تاریخ میں بنو امیہ کا آخری دَور اور بنو عباس کا وسطی دَور علوم و فنون کی ترقی اور ترویج کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ خلیفہ مامون الرشید نے یونان و روم اور ایران سے مختلف علوم و فنون کی بے شمار کتابیں منگوائیں اور اُن کا عربی زبان میں ترجمہ کروایا۔ دارالخلافہ بغداد میں دارالترجمہ کے نام سے ایک علمی اکاڈمی قائم کر دی۔ جن میں تنخواہ دار مترجمین رکھے گئے تھے۔ جس کی وجہ سے علوم و فنون کا وسیع ذخیرہ عربی زبان میں منتقل ہو گیا۔ ان میں

اسماء سے مراد اشیاء کے نام اور ان کے خواص اور فوائد کا علم ہے۔ جو اللہ نے القاء اور الہام کے ذریعہ حضرت آدم علیہ السلام کو سکھلا دیا تھا۔ ان اشیاء اور مسمیات میں طب بھی شامل تھا۔ کیوں کہ زندگی ہر آن اور ہر لمحہ صحت اور عدم صحت سے دوچار رہتی ہے۔ اس لیے حضرت آدم علیہ السلام کو طب کی تعلیم وہبی طور پر عطا کی گئی۔

علوم و فنون الہامی اور قدرتی طور پر وجود میں آتے ہیں۔ اور پھر انسان کی طرف سے ان کے لیے قواعد و ضوابط مرتب ہوتے ہیں۔ پھر ان کی تدوین اور جمع کا علم شروع ہوتا ہے۔ یہاں سے ان کی علمی و فنی حیثیت متعین ہو جاتی ہے۔ اور وہ شہرت پا جاتے ہیں۔

جیسا کہ علم فقہ کو لیجیے۔ اس کی بنیاد عہدِ نبوت میں پڑ چکی تھی اور اس کے اجزاء اور حصے عہدِ صحابہ رضؓ میں پھیل چکے تھے۔ عہدِ تابعین میں حضرت ابو حنیفۃ النعمان نے اس علم کے موجود اور منتشر اجزاء کو جمع کیا اور اصول و قواعد منضبط کیا اور فقہ کی تدوین کی۔ اس کے بعد ہی وہ ایک مستقل فن کی حیثیت سے شہرت پا گیا اور امام ابو حنیفۃ النعمان کو بانی اور مؤسس ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔

علمِ طب کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ پیش آیا۔ سب سے پہلے علم طب کو اسقلبوس نے یونان میں ایک ضابطہ کے ساتھ استعمال کیا اور قاعدہ و قانون کی روشنی میں علاج کیا تو دنیا نے اسی حکیم کو علم طب کا بانی اور موجد قرار دیا۔ اسقلبوس کے بعد افلاطون اور فیثاغورث نے طب کی دنیا میں بڑی شہرت پائی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پانچ سو سال پہلے بقراط نے طب کے اصول منضبط کیا۔ اور اس بعد ارسطاطالیس نے قواعد کلیہ کو قلم بند کیا اور دیثوفوریدوس نے ادویہ کا علم مرتب اور مدون کیے اور حکیم جالینوس نے اعضاء کے منافع وغیرہ کی تفصیل اور تشریح کی۔ علم طب کو مصر، چین، یونان اور ہندوستان کے اندر فروغ حاصل ہوا۔ پھر وہ دنیا کے سارے ملکوں میں پھیل گیا۔ اور وہ اپنی فیض رسانی اور شفاء بخشی کے باعث لوگوں میں مقبول ہوتا چلا گیا۔

اسلام کی تاریخ میں بنو امیہ کا آخری دَور اور بنو عباس کا وسطی دَور علوم و فنون کی ترقی اور ترویج کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ خلیفہ مامون الرشید نے یونان و روم اور ایران سے مختلف علوم و فنون کی بے شمار کتابیں منگوائیں اور ان کا عربی زبان میں ترجمہ کروایا۔ دار الخلافہ بغداد میں دار الترجمہ کے نام سے ایک علمی اکاڈمی قائم کر دی۔ جن میں تنخواہ دار مترجمین رکھے گئے تھے۔ جس کی وجہ سے علوم و فنون کا وسیع ذخیرہ عربی زبان میں منتقل ہو گیا۔ ان میں

علمِ طب بھی تھا۔ یونان سے پہنچنے والے اس فن کو عربی قالب میں ڈھال کر مستقل طور پہ عربی طب کا روپ بخشا یونانی طب کو عربی زبان میں ترجمہ کرنے کا سہرا موسیٰ بن خالد اور ابو یوسف البطریق کے سر ہے۔ اُن کے ہم عصر اطباء اور اُن کے بعد آنے والے اطباء و متاخرین نے ایک عرصہ تک یونانی طب کے ترجموں کی روشنی میں اپنے علاج اور تشخیص کی بنیاد رکھی۔ پھر اس میدان میں حکماء کا ایک ایسا طبقہ بھی آیا، جس نے یہ تقلیدی روش چھوڑ دی اور مجتہدانہ طریقہ اختیار کیا۔ جس کی وجہ سے نئے اصول و فروع اور نئے ضابطے اور طریقے وجود میں آئے اور طب کے اندر عربی، ایرانی، یونانی اور ہندوستانی طب کے اجزا شامل ہو گئے اور علم طب کو ایک بین الاقوامی شان حاصل ہو گئی۔

پھر جب طب کی دنیا میں ابو علی حسین بن عبداللہ بن سینا المعروف بہ بوعلی سینا نے قدم رکھا تو طب کو زمین سے آسمان کر دیا اور انھوں نے "القانون فی طب" ایک ایسی جامع الطب کتاب لکھی جس نے ساری دنیا میں شہرت پائی۔ اور اس کے بے شمار تراجم مختلف زبانوں میں ہوئے اور مشرقی و مغربی ملکوں کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں جگہ پائی اور اس کا انگریزی ترجمہ غیر معمولی شہرت حاصل کر گیا۔ جو ڈاکٹر گرونرایم نے کیا تھا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے داخلہ کے ساتھ یہاں مختلف علوم و فنون بھی آپہنچے۔ ان میں علم طب بھی تھا۔ یہاں یہ فن عربی اور فارسی کے زیر اثر رہا اور اس فن کی تعلیم و تدریس بھی عربی اور فارسی زبانوں میں ہوا کرتی تھی۔ اسلامی درس گاہوں میں طب کو غیر معمولی اہمیت اور مقبولیت حاصل ہوی۔ جتنے بھی علماء مدارس سے فارغ ہو کر نکلتے وہ حکماء بھی ہوتے تھے اور ان فارغین کے لیے یہی حکمت و طبابت معاش کا ذریعہ بنی رہی۔ اور درس نظامیہ کے نصاب میں علم طب بھی شامل تھا۔

ہندوستان میں طب کی زندگی میں نیا موڑ اس وقت آیا جب کہ وہ اردو زبان میں منتقل ہوا۔ حکیم مولوی سید غلام حسنین کنتوری نے "القانون فی الطب" کا اردو میں ترجمہ کیا۔ پھر اس کے بعد اردو زبان میں طب کے موضوع پہ بے شمار کتابیں تصنیف ہوئیں۔ اور اس زبان میں طب کی کتابیں درس میں پڑھائی جانے لگیں اور اس کا ایک مستقل نصاب تیار ہوا۔ اور جدید طرز اور سائنٹیفک اصولوں پر تدریس و تعلیم اور تشخیص کا عمل جاری ہوا آج حکومتِ ہند کی سرپرستی بھی طب کو حاصل ہو چکی ہے اور اس کا شمار انڈین میڈیسن میں ہو چکا ہے، جو دنیائے طب کے لیے ایک نیک فال اور ترقی کے لیے ایک نئی سمت ہے۔

علم طب اسلامی نقطۂ نظر سے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

العلم علمان علم الادیان وعلم الابدان ؛علم دو۲ ہیں ۔ایک دین کا علم اور دوسرا بدن کا علم ۔اور یہ دونوں علم انسان کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ دین کے علم سے اخلاق اور انسانیت کا سدھار ہے تو بدن کے علم سے جسم کی صحت وابستہ ہے ۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو جسمانی صحت ہی اصل ہے اور اسی پر دین کے بہت سارے احکام مرتب ہوتے ہیں ۔ بدن کے علم سے دین کی تبلیغ بھی جڑی ہوی ہے ۔جب کوئی بیمار کسی طبیب کے علاج سے تندرست اور صحت مند ہو جاتا ہے تو اس کے دل میں طبیب کی محبت اور عظمت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے دل میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ یہ تو میرے لیے مسیحا سے کم نہیں ۔ اس کے بعد مریض طبیب کی باتوں پر عمل کرنے لگتا ہے ۔ یہ پیروی صرف جسم اور صحت کے معاملہ تک محدود نہیں رہتی بلکہ دیگر امور و معاملات کو بھی شامل کر لیتی ہے ۔ اس صورتِ حال سے طبیب فائدہ اٹھاتے ہوے مریض کے اخلاق وعادات کو بہتر بنا سکتا ہے ۔اور اس کی تعلیم وتربیت کر سکتا ہے ۔اگر مریض اسلام کی نعمت سے محروم ہو تو اسے اسلام کے حلقہ میں شامل کر سکتا ہے ۔ اور یہ ہر ایک مسلمان کی دینی ودعوتی ذمہ داری ہے ۔ اسی کام کو انجام دینے پر مسلمانوں کو خیر امت کہا گیا ہے ۔

طب اور دینی تعلیم ایسی چیزیں ہیں کہ ان کی بدولت اسلام کی تبلیغ کی راہ ہموار ہو سکتی ہے ۔اسی لیے ہمارے بزرگوں نے دینی درسگاہوں میں علمِ طب کو داخل کر رکھا تھا ۔ تاکہ فارغ ہونے والے علم بدن سے معاش حاصل کر سکیں اور علم دین سے دعوت واصلاح کا کام انجام دے سکیں اور کسی کے محتاج اور دست نگر نہ رہیں۔ موجودہ زمانہ میں عیسائیوں نے اپنے دین کی تبلیغ کے لیے ہسپتال اور کالج قائم کر دیا، تاکہ علم بدن کے ذریعہ دینِ مسیحت کو فروغ دیں اور وہ اپنے اس منصوبے میں بڑی حد تک کامیاب ہیں ۔آج ساری دُنیا میں ان کے ہسپتال اور کالج معیاری سمجھے جا رہے ہیں اور خیر امت بھی استفادہ کرنے پر مجبور نظر آ رہی ہے ۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہم مسلمانوں کو علم الادیان اور علم الابدان دونوں دولتوں سے سرفراز فرمائیں۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ...

۱ ۔ ماں فردوس بریں ہے ۔
۲ ۔ ماں زندگی کی رونق ہے ۔
۳ ۔ ماں اپنی اولاد کے حق میں سایۂ رحمت ہے
۴ ۔ ماں صبر، تحمل کا بہترین نمونہ ہے ۔
۵ ۔ ماں مہر والفت کی حسین دیوی ہے ۔
۶ ۔ ماں عشق صادق کا ایک وسیع سمندر ہے
۷ ۔ ماں رحمت وشادمانی کا نغمہ سناتے والی نسیم سحر ہے ۔
۸ ۔ ماں رب العزت کی طرف سے عطا کردہ ایک بہترین تحفہ ہے
۹ ۔ ماں اپنے بچوں کی کشتی کی ناخدا ہے ۔

سرکارِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحب زادے اور صاحب زادیاں

کاتب محمد شریف برکاتی۔ آمبور
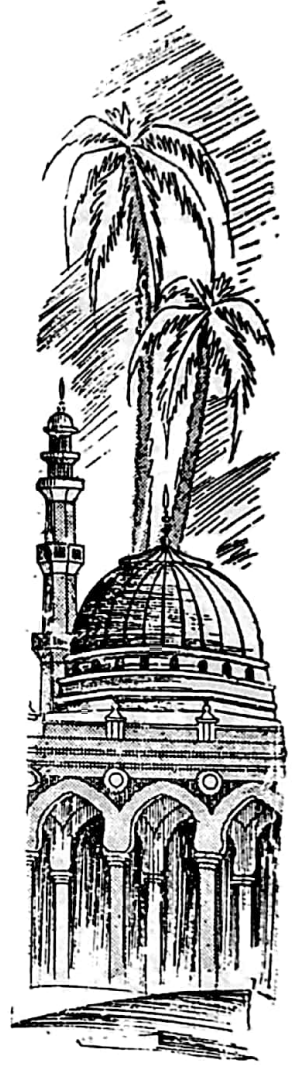
ہمارے نبی سرکارِ دوجہاں صلے اللہ علیہ وسلم کو مولائے کائنات خالق ارض وسماء نے اپنے فضل ورحمت سے صاحبِ اولاد بھی بنایا۔ تاریخ دانوں اور سیرت نگاروں نے آپ صلے اللہ علیہ وسلم کو بارہ۱۲ بچوں کا باپ بتایا ہے۔ مگر معتبر سیرت نگاروں کی کتب سیر، احادیث اور صحابہؓ کی روایات اور واقعات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلے اللہ علیہ وسلم صرف سات بچوں کے باپ تھے۔ ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کو یہ شرف حاصل ہے کہ آپ کے بطن سے دو۲ صاحبزادے اور چار۴ صاحب زادیاں تولد ہوئیں۔

۱۔ حضرت قاسمؓ۔ ۲۔ حضرت زینبؓ۔ ۳۔ حضرت عبداللہؓ (جو طیبؓ و طاہرؓ بھی کہلائے) ۴۔ حضرت رقیہؓ ۵۔ حضرت ام کلثوم۔ ۶۔ خاتون جنّت حضرت فاطمۃ الزہرا بتول رضی اللہ عنہم ان کے علاوہ ام المومنین حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا سے ایک فرزند حضرت ابراھیم رضی اللہ عنہٗ تولد ہوئے۔

بی بی خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بطن سے حضور اکرم کے سب سے پہلے فرزند حضرت قاسم رضی اللہ عنہٗ ہوئے۔ آپ کی پیدائش کے بعد سرکار دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت ابوالقاسم ہوی۔ ان کے بعد حضرت زینبؓ پھر تیسرے حضرت عبداللہؓ (جو طاہر اور طیب بھی کہلائے) ان کے بعد حضرت رقیہؓ، پانچویں حضرت ام کلثومؓ اور سب سے چھوٹی حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا تھیں۔ یہ تمام صاحب زادے اور صاحب زادیاں مکہ ہی میں پیدا ہوئیں۔

دونوں صاحب زادے کم سنی ہی میں فوت ہوئے، حضرت زینب، حضرت ام کلثوم، حضرت رقیہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنھن اسلام کی دولت سے مالا مال ہوئیں، ان کی شادیاں بھی ہوئیں۔ حضرت زینبؓ، حضرت ام کلثوم اور بی بی رقیہؓ حضورؐ کے سامنے ہی وفات پائیں اور حضرت فاطمہؓ سرکار دو جہاںؐ کے وصال کے بعد چھ مہینے زندہ رہیں بعد دنیا سے پردہ فرمایا۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے سب سے چھوٹے اور آخری فرزند حضرت ابراھیم رضی اللہ عنہ ام المومنین حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بطن سے مدینہ میں پیدا ہوئے اور ۱۶ سولہ یا ۱۸ اٹھارہ مہینوں تک زندہ رہنے کے بعد عالم جاودانی کوچ فرما گئے۔

حضرت قاسم رضی اللہ عنہ

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق حضرت قاسمؓ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور بی بی خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی سب سے پہلی اولاد ہیں۔ آپ کی ولادت نبوت کے اعلان سے گیارہ سال پہلے مکہ میں ہوی۔ آپؓ کی پیدائش کے ساتھ ہی سرکار دوجہاں کی کنیت **ابوالقاسم** ہوی۔

طبقات کی تحریر کے مطابق حضرت قاسمؓ دودھ پیتے بچے ہی تھے کہ انتقال فرما گئے۔ مولانا شبلیؒ کی سیرت النبیؐ جلد دوم میں محمد بن جبیر کے حوالہ سے تحریر کیا کہ حضرت قاسم چلنے پھرنے لگے تھے کہ انتقال فرما گئے۔ ابن فرلیس نے کہا کہ حضرت قاسم انتقال کے وقت بہت دیدار و تھے۔

آپکے فرزند حضرت قاسمؓ اور حضرت عبداللہؓ کے انتقال کے وقت عاص بن وائل الشامی نے کہا کہ محمدؐ کے فرزند انتقال کر گئے اس کی وجہ سے وہ (حضور صلے اللہ علیہ وسلم وہ تباہ حال ہے یہ آیت اسی وقت نازل ہوی۔ (ترجمہ) "بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، جو تباہ حال ہوگا اور اس کی نسل نہیں چلے گی۔ (۱۰۸:۳)

محمد بن جبیر بن مطعم نے بتایا کہ حضرت قاسمؓ نے دو سال کی عمر میں وفات پائی۔ مجاہد نے بتایا کہ حضرت قاسمؓ صرف سات دن زندہ رہے۔ ابن فرلیس کا کہنا ہی صحیح ہے۔

حضرت زینب رضی اللہ تعالےٰ عنہا

سرکارِ دوجہاں صلے اللہ علیہ وسلم اور بی بی خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی سب سے بڑی صاحب زادی حضرت زینبؓ ہیں۔ آپؓ حضرت قاسمؓ کے بعد پیدا ہوئیں۔ ابن کلبی کا کہنا ہے کہ حضرت زینبؓ ہی حضورؐ کی پہلی اولاد ہیں۔ روایات میں

ہے حضرت زینب رضی نبوت سے دس[۱۰] سال پہلے مکہ میں پیدا ہوئیں اور سرکارِ دوجہاں ﷺ کی عمر شریف تیس[۳۰] برس کی تھی۔

جب سرکارِ دوجہاں کو نبوت عطا ہوئی اس وقت ان کی عمر دس[۱۰] سال کی تھی۔ آپ رضی نے حضور اکرم اور بی بی خدیجہ رضی کی آغوشِ رحمت میں پرورش پایا۔ نبوت کے بعد اسلام سے مشرف ہوئیں۔ اسلام کی اشاعت و تبلیغ کی وجہ سے مشرکینِ مکہ نے آپ ﷺ اور دوسرے مسلمانوں کو جو تکلیفیں اور ایذائیں پہنچائیں ان میں آپ رضی اور آپ رضی کی دوسری بہنیں بھی مبتلا ہوئیں اور ان کو بخوشی بھگت لیا۔

نکاح

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت ابوالعاص ابنِ الربیع لقیط سے حضرت نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے پڑھا دیا۔ حضرت عاص رضی بی بی خدیجہ رضی کی حقیقی بہن ہالہ بنتِ خویلد کے بیٹے تھے۔ (ام المومنین آپ رضی کی خالہ تھیں) وہ تجارت کرتے تھے۔ ان کی مالی پوزیشن تھی۔ امانت اور دیانت میں اونچے تھے۔ وہ ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے۔

ہجرت سے تین[۳] سال پہلے حضرت ابوطالب اور بی بی خدیجہ رضی کا انتقال ہوا۔ مشرکینِ مکہ کو کھلی چھوٹ مل گئی آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے خاندان والوں اور عام مسلمانوں کو سخت سے سخت ایذائیں پہنچائیں۔ نبوت کے تیرھویں سال اللہ کی طرف سے ہجرت کا حکم ہوا۔ آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنا ہمرکاب بنایا اور مکہ چھوڑ مدینہ ہجرت کر گئے اور اپنے خاندان کو مکہ ہی میں چھوڑ دیا۔ مکہ والوں نے حضرت عاص رضی کو زور دیا کہ وہ بنتِ رسول ﷺ حضرت زینب رضی کو طلاق دے دے۔ ابوالعاص رضی نے ان کی بات نہیں مانی۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ہی رہے۔

سنہ ۲ ہجری میں جنگ بدر چھڑی۔ عاص نے مشرکینِ مکہ کے ساتھ اس جنگ میں شریک ہوئے مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ عاص کو حضرت عبداللہ ابن زبیر انصاری رضی نے قید کر لیا۔ ان جنگی قیدیوں کو رہا کرانے کے لیے مشرکینِ مکہ نے زرِ فدیہ بھیجا تو عاص کو قید سے چھڑوانے کے لیے حضرت زینب رضی نے کچھ مال بھیجا۔ جس میں وہ ہار بھی شامل تھا۔ جس کو ام المومنین حضرت خدیجہ رضی نے حضرت زینب رضی کو نکاح کے وقت دیا تھا۔ اس ہار کو دیکھ کر حضور اکرم ﷺ کو حضرت خدیجہ رضی کی یاد آگئی۔ صحابہ رضی سے فرمایا: مناسب سمجھو تو زینب رضی کے قیدی کو (ابوالعاص) کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔ صحابہ رضی نے حضور اکرم ﷺ کے کہنے پر انھیں رہا کر دیا۔ حضور اکرم ﷺ نے ابوالعاص سے وعدہ لیا کہ وہ مکہ پہنچ کر حضرت زینب رضی کو مدینہ بھیج دیں گے۔

ابوالعاص مکہ پہنچ کر حضرت زینب رضی کو اپنے بھائی کنانہ کے ساتھ مدینہ روانہ کر دیا۔ کنانہ نے ہتھیار سجائے

تاکہ مشرکین مکہ انھیں اور حضرت زینب رضؓ کو مدینہ جانے سے روکیں تو دفاع کر سکیں۔ سفر شروع ہوا جب مقام ذی طویٰ پہنچے تو ہبار بن الاسود اور اس کے ایک ساتھی نے راستہ روکا۔ ہبار نے اپنے نیزہ سے اونٹ کو دھکا دیا۔ اونٹ کلبلایا جس کی وجہ سے حضرت زینب رضؓ اونٹ سے گر پڑیں۔ اس کی وجہ سے آپ رضؓ کا حمل وضع ہو گیا۔ کنانہ نے تیر کمان میں چڑھایا تاکہ ان پر حملہ کرے۔ تو ہبار کے ایک ساتھی نے (ابو سفیان) نے آگے بڑھ کر کہا: کنانہ تیر کمان سے اتار دو اور ہماری بات غور سے سنو: کنانہ نے تیر اُتار لیا۔ اُس نے کہا: محمد صلعم نے جو نیا دین لایا ہے اس کی وجہ سے مکہ والوں کے دلوں میں جلن ہو گئی ہے۔ تم اُن کی بیٹی کو ان تک پہنچانے میں مدد کر رہے ہو، تو اس میں مکہ والوں کی سبکی ہو گی۔ انھیں مکہ واپس لے چلو۔ چند دنوں بعد جب مکہ والے ٹھنڈے پڑ جائیں اور توجہ نہ دیں، اس وقت بغیر اطلاع کے تم اپنے بھائی کی بیوی کو مدینہ پہنچا دو۔ چناں چہ کنانہ نے چند دنوں تک انتظار کیا اور پھر موقعہ دیکھ کر اپنی بھابی کو مکہ سے باہر لے گئے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے زید بن حارثہ رضؓ کو مکہ بھیجا کہ وہ حضرت زینب رضؓ کو مدینہ لے آئے۔ کنانہ اپنی بھابی (حضرت زینب رضؓ) کے ساتھ رات کے وقت بمقام بتنیا جاجہ، زید بن حارثہ رضؓ سے ملے اور زینب رضؓ کو اُن کے حوالہ کر کے واپس مکہ آ گئے۔ زید بن حارثہ رضؓ نے بی بی زینب رضؓ کو بحفاظت مدینہ لے گئے اور حضورؐ کی خدمت اقدس میں پہنچا دیا۔ (زرقانی)

ابو العاص تاجر تھے۔ مال دار تھے۔ دیانت داری اور امانت داری کی خوبیوں کے مالک تھے۔ اہلِ قریش آپ پر اعتماد رکھتے تھے۔ اکثر تاجر اپنا مالِ تجارت ساجھے داری میں فروخت کے لیے آپ کے حوالے کرتے تھے۔ ایک ایسا ہی تجارتی سفر ۶ سنہ ہجری میں ہوا۔ مال تجارت لے کر ملک شام کی طرف گئے ہوئے تھے۔ ان دنوں مدینہ کے مسلمانوں کا ایک دستہ شہر کی حفاظت کے لیے گشت کرتا رہتا تھا۔ اس دستہ نے مکہ والوں کے اس قافلہ کو روک لیا۔ مال لوٹ لیا اور ان سب کو قیدی بنا لیا۔ ابو العاص ان سے بچ بچا کر مدینہ پہنچے اور حضرت زینب کے پاس پہنچ کر پناہ مانگی۔ فجر کی نماز ہوتے ہی بی بی زینب رضؓ نے پکار کر بلند آواز سے کہا کہ انھوں نے ابو العاص کو پناہ دی ہے۔ اس آواز کو آنحضور صلعم اور صحابہؓ نے سُنا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قسم ہے رب کی مجھے نہیں معلوم تھا کہ عاص مدینہ میں ہے اور زینب رضؓ نے انھیں پناہ دی ہے۔ لازمی ہے کہ مسلمانوں کو اس کا پورا کرنا ضروری ہے۔

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ہاں پہنچے اور اُن سے فرمایا: بیٹی! ابو العاص کو آرام سے رکھنا اور میاں بیوی کے تعلقات سے باز رہنا کیوں کہ تم اُن کے لیے حلال نہیں ہو۔ بی بی زینب رضؓ نے عرض کیا:

یہ اپنا مال لینے آئے ہیں۔ آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس دستہ کو جمع کیا اور فرمایا: ابوالعاص کا تعلق جو ہم سے ہے اس کو تو سب جانتے ہو۔ ان کا مال تمہارے ہاتھ لگا ہے اور یہ مال تمہارا ہے۔ اگر چاہو تو ابوالعاص کے ساتھ احسان کرو اس پر تمہارا حق بنتا ہے۔ میں مجبور نہیں کرتا۔ اس ارشاد عالی کو سن کر اس دستہ نے لوٹا ہوا مال بخوشی ابوالعاص کو واپس کر دیا۔

ابوالعاص رضؓ مال واپس لے کر مکہ پہنچے۔ جن جن کا مال اور حق تھا سب کو واپس لوٹا دیا۔ اہلِ قریش سے پوچھا اس بار کی تجارت میں میں نے سب کی امانت پہنچا دی۔ سب نے کہا: ہاں! واپس کر دیا۔ تم سچے اور امانت دار ہو بہت ہی مہربان دل کے مالک ہو۔ تب ابوالعاص رضؓ نے سب سے کہا: میں مکہ میں کلمہ پڑھتا ہوں اور اسلام قبول کرتا ہوں۔ اگر مدینہ میں قبول کرتا تو تم کہتے کہ ہمارا مال دابنے کے لیے مسلمان ہو گیا۔ اب میں نے تمہارا مال سب کا سب واپس کر دیا۔ کلمہ پڑھ لیا اور مسلمان ہو گیا۔ اس کے بعد ابوالعاص رضؓ مدینہ پہنچے، خدمتِ اقدس میں حاضر ہوے۔

ابوالعاص رضؓ ایک اچھے اور نیک شوہر تھے اور وہ حضرت زینب رضؓ سے بہت محبت رکھتے تھے۔ حالتِ کفر میں بھی وہ حضرت زینب رضؓ سے محبت بھرا سلوک کرتے رہے۔ اسی دلی لگاؤ اور سلوک سے بی بی زینب رضؓ بہت متاثر تھیں۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی چھ سال کی دوری اور جدائی کو پھر سے نکاح فرما کر ملاپ میں بدل دیا۔

اولاد

حضرت زینب اور ابوالعاص رضی اللہ عنہم سے دو اولادیں ہوئیں ایک امامہ رضؓ اور دوسرے علی رضؓ۔ چند راویوں نے کہا ہے کہ علی بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ بعضوں نے تحریر کیا ہے کہ انھوں نے بڑی عمر پائی اور جنگِ یرموک میں شرکت کی اور شہید ہوے۔ فتح مکہ میں مکہ میں داخلہ کے وقت سرکارِ دوجہاں صلعم کے ساتھ اونٹ پر جو سوار تھے، وہ یہی علی تھے۔ بی بی امامہ رضؓ اور علی کی پرورش اور تربیت خود حضور صلعم نے فرمائی۔ دونوں آپ صلعم کے محبوبِ نظر تھے۔ ایک بار آپ صلعم کے پاس ایک ہار آیا۔ آپ صلعم نے فرمایا: میں اپنے گھر والوں میں اس کو دوں گا جو مجھے سب سے زیادہ پیاری ہے۔ یہ ارشاد سن کر سب نے یہی گمان کیا کہ یہ ہار بی بی عائشہ رضؓ کے گلے کی زینت بنے گا۔ مگر آپ صلعم نے ہار بی بی امامہ کے گلے میں ڈال دیا۔ بی بی امامہ کے لیے حضرت فاطمہ زہرا بتول رضؓ نے وصیت فرمائی کہ ان کی وفات کے بعد علی مرتضےٰ رضی اللہ عنہٗ امامہ سے نکاح کر لیں۔ حضرت فاطمہ رضؓ کی رحلت کے بعد حضرت علی رضؓ نے وصیت کی تعمیل کی۔

وفات

حضرت زینب رضی اللہ تعالےٰ عنہا کی وفات ۸ھ سنہ ہجری میں ہوی۔ اپنے دیور کنانہ کے ساتھ مکہ سے مدینہ ہجرت کرتے وقت ذی توا کے مقام پہ حیار بن الاسود اور اس کے ساتھی نے راستہ روکا اور

دھکا دیا اور وہ اونٹ سے نیچے گر پڑیں جس کی وجہ سے حمل جاتا رہا۔ یہ تکلیف ایسی تھی جو جان لیوا ثابت ہوئی۔ اور یہی آپ رضؓ کی وفات کا باعث بنی۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم خود لحد میں اُترے اور دُعا فرمائی کہ اے ربّ العالمین قبر کی تنگی اور اس کی گھٹن سے زینب کو محفوظ رکھ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

حضرت رقیہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا

حضرت رقیہ رضؓ نبئ کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا کی دوسری صاحب زادی تھیں۔ آپ رضؓ حضرت زینب رضؓ کی سگی بہن تھیں۔

آپ مکہ میں حضورؐ کی نبوت کے اعلان سے سات سال پہلے پیدا ہوئیں اور سرکار دو عالمؐ کی عمر مبارک ۳۳ سال کی تھی۔

نبوت کے اعلان کے بعد مشرکینِ مکہ اور قریشیوں نے حضور اکرمؐ اور مسلمانوں پر نئے نئے ڈھنگ سے ظلم وستم اور تکالیف کے دروازے کھول دیے۔ ان کا ہر ایک انداز حضور اکرمؐ کو ستانے کے لیے ہوتا تھا۔ ہر طرح سے نقصان پہنچانا ان کا روزمرہ کا وطیرہ تھا۔ روزانہ کوئی نہ کوئی فتنہ برپا کر کے ہنگامہ کھڑا کر دیتے تھے۔ وہ ابوالعاص ابن الربیع کے پاس جاتے اور ان کو اکساتے تھے کہ وہ حضرت زینب بنت محمد صلے اللہ علیہ وسلم (زوجۂ ابوالعاص) کو طلاق دے دیں۔ عاص نے ان کی باتوں پر توجہ نہیں دی۔ کیوں کہ آپؓ کو حضرت زینبؓ سے دلی لگاؤ اور الفت تھی۔ (ابنِ ہشام)

اُن سے مایوس ہو کر قریشیوں نے ابولہب کے دونوں بیٹوں عتبہ اور عتیبہ کے پاس گئے اور انھیں زور دیا کہ وہ دونوں اپنی اپنی بیویوں کو (جو نبئ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی صاحب زادیاں حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہن ہے) طلاق دے دیں۔ حضرت رقیہ رضؓ کا نکاح ابولہب کے پہلے بیٹے عتبہ سے ہوا تھا اور ام کلثوم رضؓ کا نکاح ابولہب کے دوسرے بیٹے عتیبہ سے ہوا۔ دونوں نکاح اعلانِ نبوت سے پہلے ہوا تھا۔ ان کی رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ دونوں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے گھر میں ہی تھیں۔

قریشیوں کے اکسانے پر دونوں نے طلاق دے دی۔ دوسرا بڑا سبب یہ تھا کہ ابولہب جو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا۔ آپؐ کا اعلانِ نبوت کے بعد حضور اکرمؐ کا دشمن ہوگیا۔ جہاں کہیں بھی حضور اکرمؐ بازاروں یا کعبہ کے زائروں کے درمیان وعظ فرماتے تو وہاں پہنچ جاتا اور قریب کھڑے ہو کر چلّاتا تھا کہ لوگو! اس کی نہ سنو یہ دیوانہ ہے۔

ابولہب اور اس کی بیوی ام جمیل (آپؐ کی چاچی) دونوں نے دشمنی اور ظلم و ستم کی حد کر دی۔ ام جمیل جنگل سے کانٹے دار جھاڑیاں گٹھا بنا کر سر پر لاد کر لاتی اور جدھر سے سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم گزرتے راستہ میں کانٹے دار جھاڑیاں بچھا دیتی تھی حضور اکرمؐ صبر کر کے رہ جاتے۔ اللہ تبارک و تعالےٰ نے "تبت یدا ابی لہب" سورۃ نازل فرمائی جس میں ابولہب اور اس کی بیوی کی مذمت اور کھلم کھلا دوزخ اور عذاب کی گیارنٹی بھی ہے۔ دونوں کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور انہوں نے عتبہ اور عتیبہ کو حکم دیا کہ وہ دونوں اپنی اپنی بیویوں کو طلاق دے دیں اور اگر انہوں نے حکم نہ مانا تو اُن کو عاق کر دیا جائے گا۔ اُن سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھا جائے گا۔ عتبہ اور عتیبہ نے ماں باپ کے کہنے پر طلاق دے دیا۔ [1]

حضرت رقیہؓ کا نکاح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوے تھے۔ انھوں نے اپنے اسلام لانے کا واقعہ اس طرح بیان کیا کہ وہ ایک دن کعبۃ اللہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوے تھے۔ ایک شخص وہاں آیا اور خبر دی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی بیٹی رقیہ کا نکاح ابولہب کے بیٹے عتبہ سے کر دیا ہے۔ اس خبر سے میں کچھ ہراساں ہوا۔ دکھ نے مجھے وہاں بیٹھنے نہ دیا۔ میں رقیہ کی ہر بات کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ یہ سُن کر افسوس ہوا اور کعبہ سے اٹھ کر سیدھے اپنے گھر گیا۔ یہاں میری خالہ حضرت سعدہ رضی اللہ عنہا بیٹھی ہوی تھیں۔ اُن کی خوبی یہ تھی کہ وہ پیش گوئی کرتی تھیں جو سچ ہوا کرتی تھیں۔ اسی لیے آپ مشہور تھیں۔

انھوں نے مجھے دیکھ کر کہا: او عثمان! میرے عزیز! تمہارے لیے ایک خوشخبری، تین برکتیں اور دعائیں ہیں اسی بات کو خالہ نے دوبار دہرایا۔ اور کہا اللہ تیری مدد کرے۔ تجھے شیطان کے شر سے بچاے۔ واللہ! تیرا نکاح ایک کنواری، خوب صورت اور نیک بی بی سے ہوگا۔ تم بھی ابھی تک بے شادی شدہ ہو۔ تم ایک مشہور مانی جانی شخصیت کے بیٹی سے نکاح کرو گے۔ اے عثمان! میرے عزیز! تم ایک خوش دل، ہر دل عزیز شخصیت کے مالک ہو۔ مگر افسوس! کہ تم اُس ہستی سے ابھی تک نہیں ملے ہو، جو اللہ کا رسول ہے، جس پر قرآن مقدس نازل ہو رہا ہے۔ جاؤ اُن سے ملو اور بت پرستی سے چھٹکارا پاؤ۔ میں نے خالہ سے کہا: خالہ میں نے آپ کے فرمان اور بات کو ابھی تک نہیں سمجھ سکا ہوں۔ تو اس پر انھوں نے اپنی اس بات کو اس طرح سمجھایا: محمد بن عبداللہ، اللہ کے سچّے رسول ہیں۔ جن پر وحی (قرآن مجید) نازل ہوتی ہے۔ وہ اللہ کی طرف آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کی لائی ہوی روشنی ہی اصل روشنی ہے۔ جاؤ جاؤ! ان کی آغوش میں چلے جاؤ۔ دیر نہ کرو

[1] (اسد الغابہ: طبقات اور اصابہ)

ابھی رکے رہے تو خون خرابہ ہوگا، تلواریں چلیں گی اس وقت تک بہت دیر ہو جائے گی۔

قالا کی ان باتوں کو سن کر بہت متاثر ہوا۔ میں سوچتا اور غور کرتا ہوا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ جو میرے یار صادق تھے جن سے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اُن کے ہاں پہنچا۔ مجھے سوچ میں غرق دیکھ کر پوچھا: کیا سوچ رہے ہو۔ میں کچھ بتا نہ سکا۔ انھوں نے اصرار کیا تو میں قالا کی باتیں ان کو سنائیں، میں نے یہ بھی بتا دیا کہ قالا نے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کچھ کہا تھا۔ یہ سن کر ابوبکر نے کہا: کیا سوچتے ہو عثمان! تم خود سمجھ دار اور عقل مند ہو، اچھائی اور برائی کو پہچان سکتے ہو۔ یہ قریشی اور دوسرے مکہ والے جو بتوں کو پوجتے ہیں! کیا انھوں ان بتوں کو اپنے ہاتھوں سے نہیں بنایا؟ کیا وہ دیکھ اور سن سکتے ہیں؟ کیا ان میں اتنی سکت ہے کہ وہ کسی کو فائدہ یا نقصان پہنچا سکیں؟ میں نے کہا: ہاں! یہ سب درست ہے، جو کچھ آپ نے کہا اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ آخر میں ابوبکر نے کہا: عثمان! تمھاری قالا نے تمہیں جو کچھ بتلایا ہے وہ حقیقت ہے بے شک محمد صلے اللہ علیہ وسلم اللہ کے بھیجے ہوئے سچے رسول ہیں۔ جو پیغام وہ دے رہے ہیں وہ سچا پیغام ہے۔ ان سے مل لو۔ اس میں کوئی تکلیف نہیں۔ نقصان نہیں بھلائی ہی بھلائی ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کی باتوں کا اثر ہوا۔ آپ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے۔ آپؐ نے عثمان کو دیکھ کر کہا: آؤ عثمان آؤ! میں تم کو اللہ کی طرف آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اس کو مان لو۔ میں اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں مجھے نبی بنا کر تمہاری طرف اور عالم انسانیت کی بھلائی کی طرف بھیجا ہے۔ آپؐ کی ان باتوں کا مجھ پر اثر ہوا اور میں کلمہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہوگیا۔ (اصابہ)

اس واقعہ کے بعد حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی دختر حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عثمان رضی اللہ عنہٗ سے کر دیا۔ حضرت رقیہ تو اپنی والدہ حضرت خدیجہؓ کے ساتھ ہی اسلام قبول کر چکی تھیں۔ جوں جوں مشرکین مکہ اور دشمنانِ اسلام ایمان لانے والوں کی تعداد کو بڑھتے ہوئے دیکھتے ان کی ایذا رسانیاں بھی تیز ہوتی جاتی تھیں۔ نبوت کے پانچویں سال حضرت عثمانؓ اپنی اہلیہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہٗ کے ساتھ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے ملک حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے۔

حضرت اسماء بنت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہم فرماتی ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے کہنے پر انہوں نے حضور اکرمؐ سے ہجرت کی اجازت چاہی۔ آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی۔ اس کے بعد ہی عثمانؓ اپنی اہلیہ کے ہمراہ حبشہ کو ہجرت کر گئے۔ چند دنوں بعد سرکار نے حضرت اسماء سے ان دونوں کے بارے میں پوچھا اور جب آپؐ کو یہ معلوم ہوا کہ دونوں

حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے ہیں تو سرکار مدینہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حضرت لوط اور حضرت ابراہیم علیہم السلام کے بعد عثمان ہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی بیوی کے ساتھ ہجرت کی۔

چند دنوں بعد انھیں یہ خبر ملی کہ مکہ میں حالات بہتر ہیں تو دونوں واپس مکہ آئے۔ یہاں آنے کے بعد دیکھا کہ حالات بد تر ہوتے جا رہے ہیں تو آپ دونوں پھر حبشہ کی طرف دوبارہ ہجرت کر گئے۔ چند سالوں تک حبشہ میں رہنے کے بعد واپس مکہ آئے پھر یہاں سے آپ مدینہ ہجرت کر گئے۔ یہ آپ دونوں کی دوسری اور تیسری ہجرت تھی۔

اولاد جب حضرت عثمان اور حضرت رقیہ رضی اللہ عنہم حبشہ میں مہاجرین بنے رہے وہاں انھیں ایک لڑکا تولد ہوا۔ اس کا نام عبداللہ رکھا اور حضرت عثمانؓ کی کنیت ابو عبداللہ ہوی۔ جب آپؓ حبشہ کی طرف پہلی دفعہ ہجرت کر کے جا رہی تھیں آپ کا حمل وضع ہو گیا تھا۔ دوسرے فرزند عبداللہ کی عمر چھ سال کی تھی کہ ایک مرغ نے آپ کی آنکھ پر ٹھونگ ماری، جس کی وجہ سے زخم آگیا، چہرہ پر ورم آگیا اور زہر پھیل گیا۔ اس کی وجہ سے یہ فرزند رحلت کر گیا۔ حضور اکرمؐ نے نماز جنازہ پڑھائی اور حضرت عثمانؓ نے لاشہ کو دفن کیا۔ بس آپ کی یہی اولاد تھی۔

وفات ہجرت کے دوسرے سال حضرت رقیہ کو چیچک نکل آئی۔ بدن پر آبلے آگئے تھے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کو جنگ بدر میں شریک ہونے سے روکا اور تیمارداری کے لیے مدینہ ہی میں رہنے دیا۔ اور آپؐ مسلمانوں کو ساتھ لے کر میدان بدر کی طرف مشرکین مکہ کا مقابلہ کرنے کے لیے چلے گئے۔ جس دن زید بن حارثہؓ فتح کی خبر لے کر مدینہ پہنچے حضرت رقیہ کی قبر پاٹی جا رہی تھی۔ حضور اکرمؐ جب فتحیاب مدینہ آئے اور حضرت رقیہ کی وفات کا سن کر ارشاد فرمایا: عثمان بن معظون پہلے چلے پھر رقیہ بھی گئیں۔ یہ دونوں موتیں ہجرت کے بعد مدینہ میں پہلی ہیں۔

حضورؐ نے عثمانؓ کی عدم شرکت کو شرکت کہا اور انھیں مال غنیمت میں سے حصّہ بھی دیا۔

حضرت اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا

حضرت ام کلثوم رضی اللہ تعالے عنہا حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالے عنہا کی تیسری صاحب زادی ہیں۔ آپؓ کی تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ آپؓ نبوت کے اعلان سے چھ سال پہلے پیدا ہوئیں۔ چند نے بتایا کہ سات سال پہلے پیدا ہوئیں۔ اغلب یہی ہے کہ آپؓ نبوت کے اعلان سے چھ سال پہلے پیدا ہوئیں۔ اور بی بی فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا نبوت کے اعلان سے پانچ سال پہلے پیدا ہوئیں۔

آپ اپنی والدۂ محترمہ حضرت خدیجہؓ اور اپنی بہنوں کے ساتھ اسلام میں داخل ہو چکی تھیں۔ ماں باپ کے زیر سایہ پرورش و تربیت پائیں اور جب شادی کے لائق ہوئیں تو آپؓ کا نکاح ابو لہب کے دوسرے بیٹے عتیبہ سے ہو گیا اور یہ نکاح نبوت کے اعلان سے پہلے ہو گیا اور رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ اعلانِ نبوت کے بعد ابو لہب اور اس کی بیوی ام جمیل نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم سے جو دشمنی کی، اشاعتِ اسلام کی راہ میں جو رکاوٹیں پیدا کیں، جو ایذائیں اور مصیبتیں پہنچائیں تو رب العالمین نے سورۃ اللہب کی آیات نازل فرمائیں ان کے بدلہ میں دونوں نے اپنے دونوں بیٹوں عتبہ اور عتیبہ کو الٹی میٹم دیدیا کہ وہ رقیہ اور ام کلثوم (بناتِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) کو طلاق دے دیں۔ اگر نہ دیا تو دونوں کا بائیکاٹ کر دیا جائے گا۔ ماں باپ کے حکم پر دونوں نے طلاق دے دیا۔ عتبہ نے رقیہؓ کو طلاق دے کر چپ رہ گیا۔ مگر عتیبہ نے نہ صرف طلاق دی بلکہ نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں پہنچ کر گستاخی اور بے ادبی کے ساتھ نازیبا کلمات اپنی زبان نامبارک سے نکالا۔ سرکارِ نامدارؐ نے عتیبہ کو بد دُعا دی اور اللہ سے عرض کی: اے اللہ! اپنے پھاڑ کھانے والے جانور کو اس پر مسلط فرما۔ اس وقت حضرت ابو طالب بھی موجود تھے۔ یہ بد دُعا سن کر آپ سہم گئے اور کہا: لڑکے! اس بد دعا سے تجھے چھٹکارا نہیں۔ یہ بد دُعا جب ابو لہب کو سنائی گئی تو باوجود حضورؐ سے دشمنی برتنے اور عداوت رکھنے کے وہ بھی سمجھ گیا کہ آپ کی یہ بد دُعا ضرور پوری ہو کر رہے گی۔ اس نے اپنے بیٹے عتیبہ کی حفاظت کا انتظام کرتا رہا۔

ایک سفر میں شام کو جاتے ہوے یہ قافلہ مقام زرقاء میں پڑاؤ ڈالا تو قافلہ والوں نے حفاظت کے خیال سے تمام قافلہ کا سامان ایک جگہ جمع کر کے ٹیلہ سا بنا دیا اور عتیبہ کو اس پر سلا دیا۔ اور قافلہ والوں نے اس کے اطراف گھیرا ڈال کر سو گئے کچھ دیر بعد شیر کے دھاڑنے کی آواز آئی۔ آواز کو سُن کر عتیبہ تھر تھر کانپنے لگا، اس کے ہوش و حواس اڑ گئے۔ قافلہ والوں نے اس کی ڈھارس بندھوائی۔ اس نے کہا: محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے مجھے بد دُعا دی ہے۔ قسم ہے، اُن سے زیادہ سچّا زمین پر کوئی نہیں سب سو رہے تھے۔ شیر آہستگی سے سب کو سونگھتا ہوا بڑھتا رہا اور ایک جست لگا کر عتیبہ پر پہنچا اس پر حملہ کیا اس کے ٹکڑے کر دیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی اہلیہ بی بی رقیہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد ان کی یاد سے غم گین رہا کرتے تھے۔
حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ اپنی صاحب زادی حضرت حفصہؓ (جن کے پہلے شوہر حضرت خنیس بن خذافہؓ، جو جہاد میں زخمی ہو گئے تھے اور اسی زخم کے زہر نے آپ کی جان لی) کے نکاح کے فکر میں تھے۔ انھوں نے حضرت عثمانؓ سے اس کا تذکرہ کیا تو حضرت عثمانؓ نے ہاں کہا اور نہ نہ کہا چپ سادھ لی۔ جب حضور اکرمؐ کو معلوم ہوا تو آپؐ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا: عمر! کیا عثمانؓ کے لیے ایسی عورت نہ بتا دوں جو حفصہؓ سے بہتر ہے اور حفصہؓ کے لیے ایسا شوہر نہ بتا دوں جو عثمانؓ سے بہتر ہے۔ یہ ارشاد فرما کر آپؐ نے حضرت حفصہؓ

کو اپنی زوجیت میں لے لیا اور ام کلثومؓ کو حضرت عثمان سے بیاہ دیا۔ اس نکاح کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا لقب ذوالنورین (دو نُور والے) پڑ گیا۔ آپؓ کا نکاح حضور اکرمؐ کی دو بیٹیوں سے حضرت رقیہؓ سے ان کی رحلت کے بعد حضرت ام کلثومؓ سے کر دیا۔ اسی لیے آپؓ کو یہ لقب دیا گیا۔

حضرت ام کلثومؓ چھ برس تک حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رفاقت میں رہیں۔ آپؓ شعبان ۹ سنہ ہجری میں وفات پائیں۔ ام عطیہ اور انصاری عورتوں نے غسل دیا اور حضورؐ سے کفن لے کر کفنایا۔ نماز جنازہ کے بعد حضرت ابو طلحہؓ حضرت فضل بن عباسؓ اور عثمان بن زیدؓ لحد میں اُترے اور میت کو اتارا۔ حضورؐ بہت غمگین قبر کے پاس بیٹھے آنسو بہاتے رہے آپؓ کے انتقال کے بعد حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میری دس بیٹیاں بھی ہوتیں تو میں ایک کے بعد ایک کر کے عثمانؓ کے نکاح میں دیتا تھا۔ (استیعاب، اسد الغابہ)

حضرت فاطمۃ الزہرا بتول رضی اللہ تعالیٰ عنہا

حضور اکرم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی چوتھی بیٹی ہیں۔ آپؓ کی پیدائش کے وقت حضور اکرمؐ کی عمر مبارک چالیس سال کی تھی۔ اور کعبۃ اللہ کی تعمیر نو میں اہلِ قریش مشغول تھے۔ خود سرکار دو عالمؐ بھی اس تعمیرِ نو میں حصّہ لے رہے تھے۔

آپؓ کا نام نامی فاطمہ لقب زہرا، بتول، طاہرہ اور سیدۃ النساء۔ آپؓ بروز جمعہ بوقت طلوع آفتاب ۲۰ رجمادی الآخر ۶۰۵ سنہ عیسوی مکہ میں پیدا ہوئیں۔ آپؓ کے پیدا ہونے کے چند دنوں بعد ہی حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو نبوت کا منصب عطا ہوا۔ جب آپؓ پانچ سال کی ہوئیں تو ام المؤمنین خدیجۃ الکبریٰؓ کا انتقال ہوا۔ بچّوں کی پرورش، گھر کی دیکھبال اور خانہ داری کی خاطر حضرت سودہؓ سے حضورؐ نے نکاح فرمایا۔ اس نکاح سے آپؐ اور آپؐ کے بچّوں کی غور و پرداخت اور مشکلات میں کمی ہو گئی اور آپؐ نے اشاعتِ اسلام میں دلجمعی اختیار کی۔

آپؓ بچپن سے ہی بہت صابر، راضی بہ رضا، حسّاس اور سوچ بچار کی عادی تھیں۔ بے ضرورت گھر سے باہر نہیں جاتی تھیں۔ بیکار وقت گزاری نہیں کرتی تھیں۔ ماں جب تک زندہ رہیں انھیں کے پاس بیٹھی رہتیں اور ان کے کاموں میں مدد دیا کرتی تھیں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو آپؓ کی یہ ادائیں بہت پیاری لگتی تھیں۔

جب عمر کے پندرھویں سال میں پہنچیں تو مدینہ میں ہجرت کے بعد آپؓ کا نکاح حضرت علی کرم اللہ وجہٗ سے خود

حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا۔ رخصتی سات مہینوں کے بعد ہوئی۔

اللہ تعالےٰ نے آپؓ کو امام حسنؓ، امام حسینؓ، محسن (بچپن ہی میں فوت ہوگئے) صاحب زادے اور تین صاحبزادیوں رقیہ (بچپن ہی میں رحلت ہوگئی)، ام کلثوم اور زینب رضی اللہ تعالےٰ عنہم سے نوازا۔

نوٹ: حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کے تفصیلی حالات انشاء اللہ آئندہ شمارہ میں پیش کئے جائیں گے۔

صاحب زادے حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالےٰ عنہ

حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی عمر شریف پچیس ۲۵ برس کی ہوئی آپؐ نے بی بی خدیجہ بنتِ خویلد کا مال تجارت لے کر شام کی طرف روانہ ہوئے اور دگنے نفع کے ساتھ واپس لوٹے۔ بی بی خدیجہ کے غلام میسرہ کو آپؐ کے ساتھ بھیجا۔ اور واپسی کے بعد اُن دریافت کیا گیا تو میسرہ نے آپؐ کی دیانت داری، امانت داری، اخلاق کی بلندی، کردار کی پاکیزگی اور حالاتِ سفر کے واقعات کو سُن کر بی بی خدیجہ نے نکاح کا پیغام بھیجا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ولی اور چچا ابو طالب سے اجازت پاکر بی بی خدیجہ کو اپنے نکاح میں لے آئے۔ بی بی خدیجہ کی عمر چالیس ۴۰ سال کی تھی اور وہ بیوہ بھی تھیں۔ اللہ رب العزت نے آپؓ کے بطن سے دو لڑکے حضرت قاسم اور حضرت عبداللہ (طیب و طاہر) اور چار لڑکیاں حضرت زینب، حضرت رقیہ حضرت ام کلثوم اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم تولد ہوئے۔

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں کسی اور سے نکاح نہیں فرمایا۔ بی بی خدیجہؓ کے انتقال کے بعد آپؐ نے حضرت سودہ بنت زمعہ، حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ بنت حضرت ابوبکرؓ، حضرت حفصہؓ بنت حضرت عمر ابنِ خطاب، حضرت زینبؓ بنت خزیمہ، حضرت ام سلمیٰؓ بنت ابی امیہ، حضرت زینبؓ بنتِ جحش، حضرت جویریہ بنت حارث، حضرت ام حبیبہ بنت ابی سفیان، حضرت صفیہ بنت حیی، حضرت میمونہ بنت حارث اور ریحانہ بنتِ زید اور حضرت ماریہ قبطیہ بنتِ شمعون رضوان اللہ تعالیٰ عنہم آپؐ کے ازواجِ مطہرات تھیں۔

نوٹ: حضرت ریحانہ بنتِ زیدؓ کے سلسلہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنی کتاب "نبی رحمت" میں رقمطراز ہیں کہ ریحانہ بنتِ زید پہلے اسلام قبول کرنے سے رُکی رہیں۔ پھر آپ نے اسلام قبول کرلیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو آزاد کردیا۔ پھر آپ کو اپنے نکاح میں لالیا۔

ان تمام امہات المومنین میں سے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ کسی سے بھی اولاد نہ ہوئی۔

صلح حدیبیہ کے بعد مکہ والوں کی طرف سے اطمینان ہوا تو سرکار دوجہاں صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اشاعتِ اسلام کے کام کو آگے بڑھایا۔ آپؐ نے امیر، سرداروں، بادشاہوں کو خطوط اور مکتوبات کے ذریعہ اسلام کی دعوت کا کام شروع کیا۔ اس سلسلہ میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے جن کو دعوت نامے بھیجے:

۱۔ بادشاہ حبش نجاشی ۲۔ منذر بن سادی شاہِ بحرین۔

۳۔ جیفر و عبد فرزندان نے جلندی: ملک عمان۔ ۴۔ منذر بن حارث بن ابو شمر، دمشق کا حاکم۔

۵۔ ہوذہ بن علی حاکم یمامہ۔ ۶۔ جریج بن متی مقوقس، شاہِ اسکندریہ و مصر۔

۷۔ ہرقل شاہ قسطنطنیہ۔ ۸۔ خسرو پرویز۔ شاہ فارس۔

سرکار دوجہاں صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک نامہ مصر و اسکندریہ کے بادشاہ جریج بن متی ملقب بہ مقوقس کے پاس اپنے صحابی حاطب ابن بلتعہ رضی اللہ عنہ کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ اس خط کو پا کر مقوقس نے سفیر حضرت حاطبؓ سے اچھا سلوک کیا۔ آپؐ کے نامہ مبارک کو ہاتھی دانت کے بکس میں حفاظت سے رکھنے کا حکم دیا۔ پھر حاطبؓ سے حضور اکرم صلعم کے بارے میں اور اسلام کے تعلق سے سوالات پوچھے۔ حضرت حاطبؓ نے ان سوالوں کا معقول اور تشفی بخش جوابات دیے۔ اس زمانہ کے دستور کے مطابق مقوقس نے آپؐ کے نامۂ مبارک کا جواب دیتے ہوئے آپؐ کی خدمتِ مبارک میں ذیل کے تحفہ جات بھی روانہ کئے۔ اور لکھا کہ وہ تحفوں کو قبول فرمائیں:

۱۔ دو لڑکیاں، ماریہ قبطیہ اور اس کی بہن سیرین بناتِ شمعون۔

۲۔ اپنے خاص استعمال کا گدھا۔

۳۔ ایک خچرؔ جس کا ثانی عرب میں بھی نہیں تھا۔ نام دُلدُل۔ رنگ سفید

۴۔ چند گھوڑے، اونٹ اور چند پالتو جانور۔

۵۔ کچھ سونا، چاندی، قیمتی کپڑے اور شہد۔

اس نے ماریہ قبطیہ اور سیرین کے بارے میں لکھا تھا کہ یہ دونوں بہنیں ہیں۔ قبطی خاندان کی شریف اور نیک سیرت اور معزز ہیں۔ (سیرت النبیؐ: ج اول)

دونوں بہنوں نے حضرت حاطبؓ ابن بلتعہ کی ترغیب و تہیب سے بخوشی داخل اسلام ہوئیں۔ دربار نبویؐ میں پیش ہوئیں تو حضور اکرمؐ نے دونوں بہنوں کو ام سلیمؓ بنت ملحن کے ساتھ رہنے دیا۔ ام سلیمؓ نے بھی انھیں دعوت اسلام دی۔ دونوں نے تو پہلے ہی حضرت حاطبؓ کی ترغیب سے مسلمان ہو چکی تھیں۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ماریہ قبطی کو اپنے پاس رکھ لیا اور ان کی بہن سیرینؓ کو حضرت حسّان بن ثابت کے تحویل میں۔ حضرت حسّانؓ نے سیرین سے نکاح کر لیا جن سے ایک فرزند عبدالرحمٰن نامی پیدا ہوئے۔

حضرت ماریہ بہت ہی خوب صورت، گورے رنگ اور گھنگھریالے بالوں والی تھیں۔ مقوقس نے آپؓ کے بارے میں لکھا تھا کہ بہت ہی معزز اور خاندان قبطی سے تعلق رکھنے والی شریف ہیں۔ اغلب ہے کہ حضورؐ نے ان سے نکاح کر لیا ہوگا۔ انھیں باندی کی حیثیت نہ دی ہوگی اور مقوقس کے اس تحفہ کو وہی عزت اور مرتبہ دیا ہوگا جو ایک بیوی کا ہونا ہے

آپؐ نے حضرت ماریہ قبطیہ کو اس مکان میں ٹھہرایا تھا، جس سے ایک باغ لگا تھا اور یہ مدینہ سے کچھ دور بستی عالیہ میں تھا۔ جہاں آپؐ کی کچھ جائیداد بھی تھی۔ آپؐ اکثر وہاں جایا کرتے تھے۔

حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ آپؐ کو اس کی خبر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پہنچائی اور مبارک بادی بھی دی۔ جبرئیلؑ نے فرمایا: اے ابراھیم کے باپؐ تجھ پر سلامتی ہو۔ حضور اکرمؐ صبح گھر سے باہر آئے اور فرمایا: کہ رات ایک بیٹا پیدا ہوا ہے۔ (انس بن مالکؓ) حضور بہت مسرور و شاداں تھے۔

آپؐ کو حضرت ابراھیمؓ کی پیدائش کی خبر سلمٰی کے شوہر ابو رافع نے دی۔ حضورؐ نے اس کے بدلہ میں ایک غلام انعام میں دیا۔ آپ صلے اللہ علیہ وسلم وہاں پہنچے اور اپنے فرزند کا عقیقہ فرمایا۔ بالوں کے وزن کے برابر چاندی صدقہ میں دیا اور بالوں کو زمین میں داب دیا۔ ام سلمٰی کو دودھ پلانے پر مقرر کر دیا۔ آپؐ زیادہ سے زیادہ وقت حضرت ماریہ کے گھر میں گزارتے اور اپنے صاحب زادے ابراھیمؓ سے کھیلا کرتے اور خوش ہوتے تھے۔

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں۔ کہ ایک بار حضور اکرمؐ اپنے فرزند ابراھیمؓ کو دیکھنے لیے گئے۔ بچہ جن کے ہاں دودھ پیتا تھا ان کے شوہر لوہار تھے۔ اس وقت وہ بھٹی گرم کر رہے تھے اور سارا گھر دھوئیں سے بھر گیا تھا۔ حضرت انسؓ آگے بڑھے اور ان سے کہا: ابو سیف! ذرا ٹھہرو، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں۔ یہ سن کر انھوں نے بھٹی گرم کرنا روک دیا۔ آپؐ نے بچّے کو منگوا لیا، چمٹا لیا اور خوب پیار کیا۔

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے صاحب زادے حضرت ابراھیمؓ سولہ یا سترہ مہینوں کے تھے کہ اللہ کو پیارے

ہو گئے۔ حضور اکرمؐ صلے اللہ علیہ وسلم خود وہاں موجود تھے۔ ان کی وفات پر آپؐ کے آنسو جاری ہو گئے۔ عبد اللہ بن عوفؓ بھی حاضر تھے۔ وفات کے بعد حضرت فضیل بن عباسؓ نے غسل دیا۔ خود حضور اکرمؐ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ حضرت فضل اور اسامہؓ بن زید قبر میں اترے۔ آپؐ قبر کے کنارے بیٹھے تھے۔ دفن کے بعد قبر پر پانی چھڑکا اور پہچان کے لیے قبر پر چند پتھر رکھے۔ سب سے پہلے ان کی قبر پر ہی پانی چھڑکا گیا۔ (مشکوٰۃ: اسد الغابہ) جنت البقیع میں حضرت عثمانؓ بن مظعون کی قبر کے پاس دفن کیا۔

موت پر غم کے آنسو آجانا بے صبری ہے اور نہ منع اور نہ تعجب! بلکہ فطری طور پر رحمت و شفقت و محبت جو اللہ نے رکھی ہے اسی شفقت اور رحمت کا اثر ہے۔ آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ماریہ رضی اللہ عنہ کو بیٹے کی وفات پر یہ کہہ کر تسلّی اور صبر کی تلقین فرمایا: ہمارا یہ دودھ پیتا بچّہ اس دُنیا سے رخصت ہو گیا۔ یقین جانو اللہ تعالےٰ کی طرف سے جنّت میں دودھ پلانے والیاں مقرر فرمائیں گے اور رضاعت کی مدّت پوُری کریں گے۔ (مسلم)

حضرت ابراھیمؓ کی وفات کے دن سورج گرہن تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ کسی بڑے آدمی کے مرنے پر سورج گرہن ہوتا ہے۔ اسی عقیدہ کے مطابق یہ سمجھا گیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا فرزند انتقال کر گیا ہے اسی لیے سورج کو بھی گرہن ہو گیا۔ حضورؐ کو اس کا علم ہوا تو آپؐ نے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا: چاند سورج تو اللہ کی نشانیاں ہیں اور گرہن کے ذریعہ اللہ اپنے بندوں کو ڈراتے ہیں۔ کسی کے پیدا ہونے یا مرنے سے ایسا نہیں ہوتا۔ جب بھی ایسا موقعہ آجائے تو نماز میں مشغول ہو جاؤ۔

حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ کی وفات کے بعد حضرت ماریہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا برسوں زندہ رہیں۔ حضور اکرمؐ کے بعد خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہٗ بیت المال سے آپؓ کا خرچ ادا کرتے رہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ نے آپؓ کی اسی طرح قدر دانی فرمائی۔ آخر محرم ۱۴ سنہ ہجری میں وفات پائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ نے نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں آپؓ کو سپرد خاک کیا گیا۔

ماخذات:- رحمۃ للعالمین : قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری

نبیٔ رحمت : مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صاحب زادیاں : مولانا عاشق الٰہی بلند شہری

The family of Holy Prophet (sal) by S. M. Madani

فضیلت علمِ تصوّف وصوفی

حافظ مولوی عبدالسلام لطیفیؒ

اس سے پہلے کہ فضیلت تصوّف وصوفی میں کچھ بیان کروں، یہ بات بیان کرنا ضروری ہے کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے علم وعلماء کی بہت فضیلت بیان فرمائی ہے۔ بہت احادیث اس باب میں مروی ہیں: کَمَا قَالَ عَلَیْہِ السَّلَامُ فَضِیْلَتُ الْعَالِمِ عَلَی الْعَابِدِ کَفَضْلِیْ عَلٰی اَدْنَاکُمْ۔ یعنی فضیلت عالم کی عابد پر ایسی ہے جیسے فضیلت میری تم میں سے ادنیٰ آدمی پر ہے۔

اب معلوم یہ کرنا ہے کہ یہاں کونسے علم اور عالم سے مراد ہے۔ تو اہلِ تصوّف فرماتے ہیں کہ یہاں عالمِ علمِ معرفت مراد ہے نہ محض عالمِ علمِ رسمی۔ پس اب ہر ایک علم کا عالم اس فضیلت کا دعوے دار ہے۔ اس بارے میں ہم کو کوئی ایسی میزان مقرر کرنا چاہیے، جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل منشاء معلوم ہوجائے۔ کہ وہ کون سا علم وعالم ہے، جس کو سب علم وعلماء پر فضیلت وبزرگی ہے۔ اور اس کو عقلِ سلیم بھی تسلیم کرے۔ پس ہم اسی غرض کے لیے ایک میزان قائم کرتے ہیں جس سے منشاء رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم ظاہر ہو۔

یہ بات ظاہر ہے کہ سب سے افضل وبرتر ذات باری تعالےٰ عز اسمہ ہے تو جس علم سے اس ذات کا عرفان ہو اس ذات کی معرفت ہو تو وہ علم اور اس کا عالم باقی سب علوم اور علماء سے افضل ہوگا۔ اور وہ علم اور علمِ معرفت ذاتِ الٰہی ہے، جس کو تصوف کہتے ہیں اور اس کے عالم کو عارف وصوفی کہتے ہیں۔ تو پس! ثابت ہوا کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے علمِ تصوّف واہل صوفی کی فضیلت بیان فرمائی

ہے۔ تو دورِ حاضر کے محض عالمِ علمِ رسمی اس فضیلت کے دعوے دار نہیں ہو سکتے۔ صرف صوفی حضرات اس فضیلت کے مستحق ہیں اور صرف تصوّف و معرفت کے علاوہ سب علوم ظاہری ہیں، جن میں علمِ دین بھی شامل ہے اور صرف تصوّف اور معرفت ہی علمِ باطن ہے اور باطن کو ظاہر پر تقدم ذاتی ہے۔ ذاتِ الٰہی بطون سے ظہور میں جلوہ گر ہوی اس سے معلوم ہوا کہ علمِ تصوّف و معرفت فضیلت میں سب علوم سے اوّل درجہ پر ہے اور علمِ دین یعنی شریعت دوم درجہ پر ہے۔

آغازِ تصوّف یہ حقیقت ہے کہ تصوّف آں حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کے زمانہ میں موجود تھا۔ اس وقت اس کا علاحدہ نام نہ تھا اور نہ صورت تھی، جو تبع تابعین کے بعد ہوی۔ صوفیاے کرام کا آغاز کہاں سے ہوا؟ تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دوسری صدی ہجری کے اواخر میں ایسی بابرکت ہستیاں موجود تھیں جنھیں لوگ صوفیا کے لقب سے ملقب کرتے تھے۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں یہ فن تصوّف بلندیوں پر رہا اور صوفیاء نے تبلیغی رنگ دے کر عالمِ اسلام میں اس کی ترویج و اشاعت کی۔

تصوّف کی وجہ تسمیہ صوفی منسوب بصوف ہے۔ اس لیے کہ زمانۂ سابقہ میں اہلِ باطن غایت انکسار سے صوف کا لباس پہنتے تھے۔ صوف بمعنی پشمِ گوسفند کے ہے۔ اور تصوّف اسی سے ماخوذ ہے اور مجازاً ان کے اعمال و افعال اور معارف کو تصوّف کہتے ہیں۔

تعریفِ تصوّف "جواھر الحقائق" کے شروع میں تصوّف کی تعریف سید وجیہہ الدین گجراتی صاحب "حقیقتِ محمدیہ" سے بحوالہ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں:۔

"التصوف ھو ان یمیتك الحق عنك و یحییك بہ" یعنی اللہ تجھ کو تجھ سے مار ڈالے اور خود تجھ کو زندہ فرمادے"، جس کا مطلب یہ ہے کہ صوفی وہ ہے جو فنا فی اللہ و باقی باللہ ہو۔ حضرت شیخ عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ، حضرت سید الطائفہ جنید بغدادی علیہ الرحمہ سے سوال کیا کہ صوفی کون ہے؟ تو انھوں نے فرمایا:

ھو الذی یکون فی وجھہ حیاءٌ و فی عینیہ بکاءٌ و فی قلبہ صفاءٌ و فی لسانہ ثناءٌ و یدہ عطاءٌ و فی وعدہ وفاءٌ و فی نطقہ شفاءٌ یعنی صوفی وہ ہے جس کے چہرے پہ حیا ہو، جس کی آنکھیں پُرنم ہوں اس کے قلب میں صفائی ہو، اس کی زبان پہ حمد و ثناء ہو۔ اس کے ہاتھ میں جود و عطا ہو، اس کے وعدے میں وفا ہو، اس کے کلام میں شفاء ہو۔

تصوّف کی بنیاد کتاب وسنت پر قائم ہے

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ھٰذا علمنا مشید بالکتاب والسنۃ ۔ یعنی ہمارا علم تصوّف کتاب وسنّت کی بنیادوں پر قائم ہے ۔ مجدّدالف ثانی ، شاہ عبد العزیز محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہم بھی اس کی تائید کرتے ہیں ۔ حضرت ابو القاسم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اُن کا پختہ عقیدہ تھا کہ تصوّف کی بنیاد کتاب وسنّت کی تصریحات پر ہے ۔ لہٰذا جو شخص ان نعمتوں سے محروم ہے اس نے تصوّف کی بو نہ سونگھی ۔ بعض صوفیائے کرام نے اپنی جدوجہد سے تصانیف لکھیں اور تصوّف کو اپنے زورِ قلم سے نکھارا اور اس کے مختلف گوشوں کی وضاحت کی ۔ ہر فن کی کچھ نہ کچھ اصطلاحات ضرور ہوتے ہیں ۔ اسی طرح تصوّف کے بھی اصطلاحات ہیں ۔

آج بعض لوگ یہ اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ تصوّف کوئی چیز نہیں ہے ۔ جواباً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ فنِ تصوّف کی اصطلاحات کو بغور پڑھیں اور تصوّف کی کتابوں کا مطالعہ کریں تو وہ یقیناً اس کی حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیں گے ۔

ایک فقیہہ نماز ، روزہ ، زکوٰۃ ، حج کی ظاہری تفصیلات بیان کر کے مطمئن ہو جاتا ہے اور ان کے فلسفہ سے قطعاً تعرض نہیں کرتا ۔ ایک متکلم صرف عقائد کی حد تک فکر و تعمق کی صلاحیتوں کو حرکت میں لاتا ہے ۔ ایک مورخ صرف واقعات بیان کرتا ہے مگر اُن گزشتہ حقائق کا ہماری موجودہ زندگی سے کیا تعلق ہے ؟ اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا ۔ اسی طرح ایک محدّث صرف احادیث و روایات کی حد تک مسئلہ کی چھان بین کرتا ہے مگر کسی مسئلہ کی گہرائی میں ڈوب کر اس کے اندر جو معنویت پائی جاتی ہے ، اس کو تلاش کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا ۔ مگر صوفی جب ان مسائل پر گفتگو کرے گا تو اس کا اندازہ ان تمام سے مختلف ہوگا ۔ وہ نماز میں جو معنویتیں ہیں ان کی نشان دہی کرے گا ۔ ایک روحانی فلسفہ کو نکھار کر نظر و بصر کے سامنے لائے گا اور بتائے گا کہ عبادات کے اس نظام کو تقربِ الی اللہ کے لیے کیوں کر استعمال کیا جا سکتا ہے تیز بتائے گا کہ عبادات کو فکر و تعمق یا تاثیر پذیری کی اعلیٰ قدروں میں کیوں کر بدلا جا سکتا ہے ۔

(ماخوذ از تعلیمات امام غزالیؒ)

آج دُنیا کے بڑے بڑے مفکرین ، جنھوں نے انسان کی ظاہری زندگی کو آراستہ کیا ہے اور وہ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ باطنی زندگی بھی اسی طرح آراستہ ہو ، یہ محال ہے ۔ کیوں کہ اس وقت تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک فنِ تصوّف کو اپنا ذریعہ نہ بنائے ۔

اور تصوّف ایک ٹھوس حقیقت ہے، جس کے بغیر فقہ کی کوئی حقیقت نہیں رہ جاتی۔ یہ وہ علم ہے جس سے انسان حقائق عالم سے واقف اور اسرارِ کائنات سے روشناس ہوجاتا ہے اور اس کو اپنی عبادت میں لذّت اور اپنے اعمال میں سکون نصیب ہوتا ہے اور جس کے بغیر عبادتیں خشک اور اپنے اعمال میں اضطراب پیدا ہوجاتا ہے۔

مقصدِ تصوّف تصوّف کا مقصد تزکیہ نفس اور اخلاق کی درستگی اور انسان کے ظاہری و باطنی تعمیر کے احوال کا علم ہوتا ہے۔ اللہ کی قربت حاصل کرنے کے لیے تزکیۂ نفس بہت لازمی ہے۔ کیوں کہ یہ نفس ہی تمام گناہوں کی جڑ ہے۔ اس نفس کے تعلق سے حدیث میں آیا ہے: انّ فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله الا وهی القلب

بے شک انسان کے جسم میں ایک لوتھڑا ہے جب وہ ٹھیک ہوجاتا ہے تو تمام جسم درست ہوجاتا ہے اور جب وہ خراب ہوجاتا ہے تو تمام جسم خراب ہوجاتا ہے۔ جان لو کہ وہ لوتھڑا دل ہی ہے۔

ہمارے لیے ضروری ہے کہ تزکیہ نفس کرتے ہوئے مشائخ صوفیاء کے نقش قدم پر چل کر اپنی دُنیا و آخرت کو درست کرلیں۔ تصوّف کے بغیر یہ چیز حاصل ہونا دشوار ہے۔

بس اس مادی دنیا میں جو سائینس کا دور ہے، ضروری ہے کہ تمام خیالات کو دل و دماغ سے خالی کرکے واجب الوجود کی طرف متوجّہ ہوجائیں اور حقیقی معنوں میں مومن اور وراثت کا حقیقی حقدار بنیں۔ کیوں کہ زندگی کا مقصدِ اصلی یہ ہے کہ خداشناسی کو حاصل کرے۔ لیکن یہ اسی وقت ہوگا جب کہ قربِ الٰہی کے رموز سے آشنا ہوجائے خودی کو فنا کرکے خدا کو حاصل کرلے۔

خدائے تعالےٰ ہمیں اپنے حبیب صلّی اللہ علیہ وسلّم کے صدقہ میں اپنے اسرار و حقائق سے واقف فرماتے ہوئے کونین کی سرخروئی سے سرفراز فرمائے آمین بجاہ سید المرسلین۔

نہ کتابوں سے نہ واعظوں سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

ایمان کی حقیقت

سیّد عبدالستّار ۔ پیش امام نورانی مسجد گنتکل

ایمان کا مطلب یقین کرنا، جان لینا، بھروسہ کرنا۔ یقین کرنا کہ اللہ ایک ہے اور محمد مصطفٰے صلے اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ بے شک ہم کو زبان سے ہی نہیں بلکہ دل سے بھی یقین کرنا اور اس پر عمل کرنا چاہیے

میں آپ کو ایک سچی حکایت بتاؤں کہ ایمان کی حقیقت کیا ہے ؟ اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے چالیس سال تک عام آدمیوں کی طرح زندگی بسر کی۔ کبھی جھوٹ نہیں کہا۔ کبھی کسی سے لڑائی نہیں کی۔ کبھی کوئی برا کام نہیں کیا۔ کبھی امانت میں خیانت نہیں کی۔ اس لیے مکہ کا ہر انسان انھیں سچّا آدمی، امانت دار آدمی خیال کرتا تھا اور انھیں صادق اور امین کے لقب سے پکارتا تھا۔ اس وقت مکہ میں ہر انسان برائیوں میں مبتلا تھا، حرام اور حلال کی کوئی تمیز باقی نہ تھی۔ برہنہ ہو کر دن میں مرد اور رات میں عورتیں کعبہ کا طواف کیا کرتے تھے۔ کعبہ کو خدا کا گھر مانتے تھے لیکن اس گھر میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔ ہر روز ایک بت کی پوجا کرتے تھے۔ پہاڑوں کو، درختوں کو، دریاؤں اور نالایوں کو، ہاتھی، شیر، خنزیر، گائے، گدھے، چاند اور سورج کو اور ہوا کو اور ہر طاقت والی چیز کو خدا مانتے تھے۔

اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں جاتے اور وہاں جاکر خدا کی عبادت میں مشغول ہو جاتے جب آپ کی عمر مکمل چالیس سال کی ہو گئی تو اللہ کے حکم سے غارِ حرا میں حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور آپ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا: اِقْرَا۔ پڑھیے۔ آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہا (ما انا بقاریٔ) میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔ پھر حضرت جبرئیل علیہ

السلام نے آپ صلے اللہ علیہ وسلم کو پکڑ کر زور سے بھینچا اور پھر چھوڑ دیا اور کہا اِقْرَأْ۔ آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے وہی جواب دیا ھا انا بِقَارِیٔ۔ فرشتہ نے پھر تیسری مرتبہ آپ صلے اللہ علیہ وسلم کو زور سے بھینچا اور پھر چھوڑ کر کہا: اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ o اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ o عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ o پڑھیے اپنے رب کے نام سے۔ جس نے ہر شئے کو پیدا کیا۔ اور انسان کو جمع ہوئے خون سے پیدا کیا۔ پڑھ تیرا رب بڑا بزرگ ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ یہ کہہ کر فرشتہ غائب ہو گیا اور آپ صلے اللہ علیہ وسلم وہاں سے خوفزدہ حالت میں گھر تشریف لائے۔ اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم جب گھر آئے اور غارِ حرا کا سارا حال ام المؤمنین حضرت سیدتنا خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کو سنایا۔ عورتوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والی آپ ہیں اور مردوں میں سب سے پہلے ایمان والے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے اور بچوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے، جن کی عمر دس یا بارہ سال کی تھی اور غلاموں میں پہلے ایمان لانے والے حضرت زید بن حارث رضی اللہ عنہ تھے۔ یہ چاروں حضرات دین کے چار ستون کہلائے۔ اور اس طرح اسلام کی عمارت کے پانچویں ستون حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔ اسلام کو ایک ستون کے اضافہ کے بعد اور زیادہ قوت حاصل ہوی۔ ایمان کی حقیقت کو جاننا ہو تو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے واقعہ پر غور کریں۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اس قدر جلیل القدر اور عظیم المرتبت صحابیٔ رسول ہیں جن کے سلسلہ میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زبانِ فیض ترجمان سے فرمایا کہ مااظلت الخضراء وما اقلت الغبراء اصدق لھجۃ من ابی ذر۔ یعنی آسمان کسی ایسے شخص پر سایہ فگن نہیں ہوا اور نہ زمین کسی ایسے شخص کو کندھوں پر اٹھایا جو ابوذر سے زیادہ سچی زبان رکھتا ہو۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا تعلق قبیلۂ غفار سے تھا۔ یہ قبیلہ مکہ اور شام وفلسطین کے درمیان واقع تھا۔ قبیلۂ غفار کی معیشت ان تجارتی قافلوں پر تھی۔ جو بھی تجارتی قافلہ ادھر سے گزرتا تو اس مقام پر رکتا۔ تو یہ قبیلہ والے ان کی دیکھ بھال کرتے، خدمت کرتے۔ ان کے لیے جو کچھ عطیات دیے جاتے تھے انھیں پر زندگی گزارتے۔ کافی دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ دن بہ دن قبیلہ بڑھنے لگا تو ان میں غریبی بڑھنے لگی تو بھوک کی مجبوری سے قافلہ والوں پر حملہ کرکے ان کا مال لوٹنے لگے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے بھی ابتداء میں اپنے قبیلہ کا یہی پیشہ اختیار کیا تھا۔ لیکن نہ جانے کیا وجہ ہوی کہ انھوں نے اچانک لوٹ وغارت گری چھوڑ دی۔ اس کے ساتھ ساتھ بتوں سے بھی بیزار ہو گئے تھے۔ کیوں کہ تمام قبیلہ والے بتوں کی پرستش کیا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے طور پر جیسے ان کی

سمجھ میں آیا ایک خدا کی عبادت شروع کردی تھی اور کسی نبی کی آمد کا انتظار کرنے لگے تھے۔ جب مکہ میں آفتابِ نبوت طلوع ہوا اور اس کا چرچا سُن کر اپنے بھائی انیس کو صحیح حالات معلوم کرنے کے لیے مکہ روانہ کیا۔ انیس مکہ آئے اور تمام حالات معلوم کر کے اُن کو خبر دی کہ خدا کی قسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ شاعر ہیں نہ کاہن ہیں جیسا کہ لوگ کہا کرتے ہیں بلکہ سچّے ہیں صادق اور امین ہیں۔ اس مختصر سے جواب سے ان کو تسلی نہ ہوی۔ وہ خود حق کی تلاش میں سچّائی معلوم کرنے کے لیے مکہ روانہ ہوے۔ وہ نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو نہیں پہچانتے تھے۔ انھوں نے ارادہ کرلیا کہ میں کسی سے دریافت نہ کروں گا، بلکہ خود جاکر میں ان سے ملوں گا اور آپ صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں دریافت کرنا خلاف مصلحت سمجھا تھا۔ وہ کعبہ میں آکر لیٹ گئے۔ رات کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہٗ کا اِدھر سے گزر ہوا، اور انھیں یہ دیسی سمجھ کر گھر لے گئے۔ ان کو کھانا کھلایا اور ابوذر غفاری رضی اللہ عنہٗ سے کچھ دریافت نہیں کیا۔ صبح ہوتے حضرت علی کے مکان سے نکل کر کعبہ میں گئے اسی طرح مسلسل تین راتیں گزاریں تیسری رات حضرت علیؓ نے مکہ آنے کا سبب پوچھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہٗ سے کہا کہ آپ وعدہ کریں کہ مجھے میرے مطلوب تک پہنچائیں گے۔ تو میں آنے کی غرض بتا سکتا ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہٗ نے وعدہ کیا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہٗ نے مکہ آنے کا اصل سبب بتایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہٗ بہت خوش ہوے اور ان کو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے اور ملاقات کی تمام باتیں بتائیں۔ بعد اس کے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہٗ حلقہ بگوشِ اسلام ہوے۔ مکہ میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہٗ کے قیام کو چند روز گزر گئے تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اُن کو حکم دیا کہ وہ اپنے قبیلہ میں جاکر اسلام کا چرچا کریں اور سردارانِ مکہ سے اپنے ایمان کو چھپا رکھیں۔ اس وقت انھوں نے کہا: میں سردارانِ قریش کے سامنے اپنے ایمان کا عام اعلان کروں گا اور ان کو بھی دینِ اسلام کی طرف دعوت دوں گا۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منع کرنے کے باوجود خانۂ کعبہ میں گئے اور سردارانِ قریش کے سامنے اعلان کیا:

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ: یہ کلام سُننا ہی تھا کہ سردارانِ قریش دوڑ پڑے اور اُن کو خوب مارا۔ اس وقت حضرت عباس رضی اللہ عنہٗ نے جو کہ اس وقت ایمان نہیں لائے تھے ان کو بچایا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہٗ بری طرح لہولہان ہوگئے۔ چوں کہ دینِ اسلام کا شوق وجذبہ ان کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا سو انھوں نے دوسرے دن بھی خانہ کعبہ میں سردارانِ قریش کے سامنے اسلام لانے کا اعلان کیا۔ ایمان کی حقیقت کو سب کے سامنے پیش کیا۔ سردارانِ قریش پھر اُن پر ٹوٹ پڑے اور اتنا مارا اتنا مارا کہ تمام بدن سے خون کے فوارے نکلنے لگے۔ جان نکل جانے کے قریب تھی۔ اتنے میں حضرت عباس رضی اللہ عنہٗ نے پھر اُن کو بچالیا اور تمام سردارانِ قریش کو خبردار کیا۔ جانتے ہو یہ شخص

کون ہے؟ نہ جانتے ہو تو جان لو۔ یہ قبیلۂ غفار کا مانا ہوا شخص ہے۔ اگر یہ خبر اُن لوگوں کو مل جائے تو تمہارے تجارتی قافلوں کا کیا حشر ہوگا؟ اس راستے سے تمہارا چلنا دشوار ہو جائے گا۔ اس خوف سے ان لوگوں نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہٗ کو چھوڑ دیا۔ آپ ایمان کی حقیقت جان کر اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ اسلام کو ظاہر کرنے میں خوف نہیں سمجھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ اپنی جان جانے کی بھی پروا نہیں کی۔ یہ ہے وہ ایمان جو انسان کے اندر کی دُنیا بدل دیتا ہے۔ ایمان انسان کے اندر ایسی قوت وطاقت پیدا کر دیتا ہے کہ دُنیا کی کوئی بھی طاقت اُسے ایمان سے ذرّہ برابر بھی روک نہیں پاتی۔

ایک اور حکایت پیش کروں گا۔ تاکہ معلوم ہو کہ ایمان کی حقیقت کیا ہے؟

جب دن بہ دن اسلام کا بول و بالا ہونے لگا اور کفارِ مکہ کے دل دہلنے لگے تو اس کو روکنے کی بہت کوششیں کرنے لگے اور اس بات کا چرچا بھی ہونے لگا کہ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو دیکھ لیتا اور اُن کے کلام کو سُن لیتا ہے وہ ان کے دین کو قبول کر لیتا ہے۔ امیہ نامی ایک بہت بڑا مالدار تھا۔ اس کا ایک لڑکا تھا۔ وہ لڑکا بہت منت وسماجت کے بعد پیدا ہوا تھا۔ جس وقت لڑکے کی عمر بارہ یا تیرہ سال کی تھی۔ امیہ اس بات پر غور کرنے لگا کہ ہمارا دین اور بُت پرستی صدیوں سے چلی آرہی ہے۔ ہمارے باپ داداؤں کی زندگی کا خاتمہ اس بُت پرستی پر ہوا۔ لیکن یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم نیا دین لایا ہے جو محمدؐ کو دیکھ لیتا ہے یا اُن کے کلام کو سُن لیتا ہے وہ ایمان لے آتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو دیکھ لوں یا اُن کے کلام کو سن لوں۔ کہیں میں بھی اپنے دین سے مکر جاؤں۔ میں اپنے داداؤں کے دین کو چھوڑ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے نئے دین کو قبول کر لوں۔ اس لیے امیّہ نے قسم کھالی کہ جس راستہ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلّم گزرتے ہیں وہ راستہ چھوڑ دوں گا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو نہ دیکھوں گا اور اس بات کا مجمع عام میں اعلان بھی کر دیا۔ اور اس کی بیوی نے بھی کہہ دیا کہ تم بھول کر بھی اس راستہ سے گزرنا اور نہ اُن کے کلام کو سُننا۔ کہیں ہمارے بزرگوں کے دین سے یا نہ آجاؤ۔ تو بیوی کی بھی اس بات کو مان لیا۔ اور اکلوتے بیٹے سے بھی کہا: دیکھو بیٹا! تم بھی اس راستہ سے مت گزرو، جس راستہ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلّم گزرتے ہیں۔ کیوں کہ وہ بہت بڑے جادوگر ہیں۔ جادوگری سے دلوں کو پھیر لیتے ہیں۔ (نعوذ باللہ) لیکن بچّہ کے دل میں یہ شوق ہوا کہ جادوگر کیسا ہوتا ہے دیکھ لوں۔ بچّوں کی ضد بھی عجیب ہوتی ہے کہ جس چیز کو نہ دیکھنے کو کہتے ہیں اسی کو دیکھنے کا شوق کرتے ہیں۔ ایک دن اچانک محمد صلی اللہ علیہ وسلّم صفا ومروہ کے قریب لوگوں کو جمع کر کے وحدانیت کا اعلان کر رہے تھے۔ یہ لڑکا وہاں پہنچا۔ لڑکے نے محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو دیکھ لیا اور اُن کے سچّے کلام کو بھی سُن لیا۔ اتنے میں کفارِ مکہ جمع ہوئے۔ اُن پر مٹی اور پتھر مارنے لگے اور سیٹیاں بجا بجا کر شور مچانے لگے۔ جمع ہوئے تمام لوگوں سے کہنے لگے کہ یہ دیوانہ ہے اسی لیے اس کی باتوں میں نہ آنا۔

یہ کہتے ہوئے لوگوں کو درہم برہم کر دیا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت جو کلام کہہ رہے تھے وہ یہ کلام تھا: اے لوگو! تم جن کو پوجتے ہو وہ خدا ہو نہیں سکتے۔ کیوں کہ ان بتوں کو تم خود اپنے ہاتھوں سے بناتے ہو۔ اُن پر ایک مکھی بیٹھی تو اُسے اڑا نہیں سکتے، وہ کیسے خدا ہو سکتے ہیں؟ خدا تو وہ ہے جو تمہیں اور ہمیں پیدا کیا اور سارے جہاں کو پیدا کیا۔

جہاں کی ہر چیز کو ہمارے لیے پیدا کیا اور ہم کو خاص کر اس کی عبادت کے لیے پیدا کیا۔ یہ تمام منظر اس لڑکے نے دیکھا اور کلام کو بھی سُنا۔ کلام میں سچّائی نظر آئی۔ اور دل میں عشقِ رسول جاگ اٹھا۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ منور نظر آنے لگا اور دل میں ایمان کی تجلیاں چمکنے لگیں۔ خاموشی سے گھر پہنچا اور خاموشی کے ساتھ بستر پر لیٹ گیا۔ عشق کے مرض میں مبتلا ہو گیا اور کھانا پینا چھوڑ دیا اور اپنے ماں باپ سے گفتگو کرنا بھی چھوڑ دیا۔ والدین پریشان تھے۔ علاج کے لیے حکیموں کو دکھلایا گیا۔ کچھ بھی علاج نہ ہو سکا اور بھوت پریت اتارنے والوں سے بھی علاج کروایا۔ لیکن کوئی اثر نہیں ہوا۔ لڑکا دن بہ دن گھٹنے لگا۔ نوبت یہاں تک آگئی کہ موت کا وقت قریب ہونے لگا بستر مرگ پر لڑکا پڑا ہوا ہے۔ ماں روتی ہوئی لڑکے کے قریب بیٹھی ہوئی تھی، باپ چار پائی کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ اور اپنی بیوی سے درد بھری آواز سے کہہ رہا ہے: یہ تمام جائداد، یہ تمام دولت کس کام کی؟ جب یہ میرا بیٹا نہ رہا۔ بیٹے کچھ آرزو ہو تو کہو، ان لات و عزیٰ نامی بتوں کی قسم! اگر مجھ سے ہو سکے تو آسمان کے ستارے بھی تمہارے لیے توڑ لاؤں۔ تو ماں بچّے سے کہتی ہے دیکھو بیٹا! تمہارے باپ تمہارے لیے کیا کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ بتاؤ بیٹا! تمہاری کیا آرزو ہے؟ ان باتوں کو سُن کر بچّے کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے۔ بچّہ کبھی اپنی ماں کی طرف دیکھتا اور کبھی باپ کی طرف دیکھتا۔ ماں نے کہا۔ بیٹا تم مت گھبراؤ۔ کوئی آرزو یا تمنّا ہو تو بتاؤ۔ تو بچّے نے ہلکی سی آواز میں ماں سے کہا: کیا تم میری آرزو پوری کرو گے؟ تو باپ نے جوش و خوشی کے ساتھ کہا؛ ہمارے خدا لات و عزیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہاری ہر آرزو پوری کروں گا۔ تو بچّے نے کہا: بابا! میری آرزو یہ ہے کہ میں ایک بار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ باپ نے اس بات کو سنا تو غصّہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں فوراً تلوار میان سے کھینچی اور کہنے لگا خبردار! پھر ایک بار تو نے اس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیا تو میں خود تیری گردن اڑا دوں گا فوراً بیوی کہہ اٹھی کہ تم نے ہی کہا تھا کہ بیٹے کی ہر آرزو پوری کروں گا۔ اور اپنے خداؤں کی قسم کھائی۔ اگر واقعی تمہارے خداؤں پر اتنا ایمان ہو تو تم اس قسم کو پوری کرو اور میرے بچّے کو ایک مرتبہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھاؤ۔ شاید میرا بچّہ بچ جائے۔ اُمیہ کا ایمان اپنے خداؤں پر اتنا پکّا تھا کہ قسم پوری کرنے کے لیے گھر سے نکل پڑا اور جس راستہ سے نہ جانے کا اعلان کیا تھا اب وہ اسی راستہ پر گزر رہا تھا۔ تو لوگ تعجب سے دیکھنے لگے، اپنے ہاتھ میں تلوار لیے ہوئے غصّہ کی حالت میں نہ جانے والے

راستہ پر جا رہا تھا۔ تو لوگ اُمیہ کے پیچھے لگ گئے۔ کیوں کہ اس وقت مکہ میں یہ حالت تھی کہ اگر کسی شخص کی میان سے تلوار نکل آتی تو سمجھ لیتے کہ کچھ ہونے والا ہے۔ اُمیہ سیدھا محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے گھر پہنچا اور چلاّ کر کہنے لگا: اے محمد صلے اللہ علیہ وسلّم اگر واقعی تم اللہ کے رسول ہو تو میرے ساتھ چلو۔ یہ سُن کر رسول صلی اللہ علیہ وسلّم اُمیہ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ صحابۂ رسول کہنے لگے: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اُمیہ کے ساتھ چلنا خطرہ سے خالی نہیں۔ تو اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم نے کہا: اے صحابہ! مت گھبراؤ۔ ہمارے ساتھ اللہ ہے۔ اُمیہ کے ساتھ اس کے گھر تک پہنچے۔ اُمیہ گھر کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر کہنے لگا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلّم تم اندر جاؤ۔ تو اللہ کے رسولؐ گھر کے اندر گئے۔ جیسے ہی اُمیہ کی بیوی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو دیکھا تو فوراً بچّے کے قریب گئی اور کہنے لگی: بیٹا! آنکھ کھولو اور اپنی آرزو پوری کر لو۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم آ گئے ہیں۔ جیسے ہی آپ صلے اللہ علیہ وسلّم کے آنے کی خبر بچّے کے کان میں پہنچی تو بچّے نے فوراً آنکھ کھولی۔ اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اٹھنے کی طاقت نہیں رہی۔ تو فوراً محمد صلی اللہ علیہ وسلّم اس بچّے کے قریب پہنچے اور اس بچّے کو اٹھنے سے روکا اور اس کو تسلّی دیتے ہوئے کہنے لگے۔ بیٹا! بتلاؤ کیا کہنا چاہتے ہو۔ تمہیں کیا تکلیف ہو رہی ہے؟ تو کہنے لگا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم میری ایک آرزو تھی کہ مرنے سے پہلے ایک مرتبہ آپ کا دیدار کر لوں۔ یہ آرزو میری پوری ہوئی پہلی مرتبہ میں نے آپؐ کو دیکھا اور وحدانیت کا اعلان سُنا۔ اسی وقت میں ایک خدا پر ایمان لایا اور آپ کو سچا رسول مان لیا۔ لیکن میں نے آج تک دین کا کوئی کام نہیں کیا۔ کیا میں اسلام میں داخل ہوا؟ کیا میرے ایمان کو اللہ نے قبول کر لیا؟ تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم نے کہا: دیکھو بیٹا! تم یقین کر لو میں اس کا ضامن ہوں، تم اسلام میں داخل ہو چکے ہو۔ بچّے نے اس کلام کو سُنا تو لڑکے کی زبان سے کلمہ جاری ہوا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہتے ہوئے اس بچّے کی روح قبض ہو گئی تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم نے کہا: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ گھر سے باہر نکلے۔ اُمیہ یہ تمام منظر دیکھ رہا تھا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلّم جانے لگے تو اُمیہ چلاّ کر کہا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلّم رُک جاؤ! یہ بچّہ ہمارے مذہب سے نکل گیا اور یہ تمہارے دین میں داخل ہو گیا۔ اس لڑکے کی میّت تمہاری امانت ہے۔ اس کو لے جاؤ۔

یہاں غور کرنے کا مقام ہے، اُمیہ تو کافر تھا۔ اس کے دین پر اس کا ایمان پکّا تھا۔ جو لڑکا اکلوتا تھا۔ منت و سماجت سے پیدا ہوا تھا۔ اور جسے نہایت لاڈ و پیار سے پالا تھا۔ لیکن جب اپنے دین سے نکل گیا تو اس بچّے کے مرنے پر اسے کوئی غم نہیں رہا اور کہا کہ یہ میری امانت نہیں، تمہاری امانت ہے لے چلو تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم نے خوشی سے اس بچّے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا اور مکہ کی تنگ گلیوں سے ہوتے ہوئے اس لڑکے کی میّت کو اپنے گھر لے گئے۔ جب سے

نبوت کا اعلان کیا تھا، مسلمانوں میں سب سے پہلے اس لڑکے کی میت ہی پہلی میت تھی۔ بچے کو نہلا دھلا کر چارپائی پر لٹایا اور کفن پہنایا۔ اس لڑکے کی میت کو کندھے بدلتے ہوئے لیے جا رہے تھے تو اللہ کے رسول کے چلنے کا انداز نرالا تھا۔ نماز جنازہ کے بعد لحد کے قریب جنازہ کو رکھا۔ بعد خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم لحد کے اندر اترے اور لحد میں بہت دیر تک جھکے رہے۔ جب اٹھ کھڑے ہوئے تو اللہ کے رسول کے چہرے سے پسینہ ٹپک رہا تھا اور پسینہ کے قطروں سے میت کا کفن بھیگ چکا تھا۔ دوزخ کی آگ کی کیا مجال کہ اس میت کے کفن کو جلائے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم لحد سے باہر تشریف لے آئے اور لحد کو مٹی سے بھر دیے۔ صحابہ کرام نے پوچھا۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ میت کے ساتھ چل رہے تھے تو اپنے پورے قدم جما کر نہیں چل رہے تھے صرف انگوٹھوں کے بل چل رہے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم لحد میں بہت دیر تک جھکے رہے جب اٹھے لحد سے تو آپ کا چہرہ پسینہ سے شرابور تھا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس لڑکے کی میت کے ساتھ ستر ہزار فرشتے شامل تھے مجھے پورا قدم رکھ کر چلنے کے لیے زمین پر جگہ نہیں تھی۔ اس لیے مجھے انگوٹھوں کے بل چلنا پڑا۔ جب لحد میں اترا تو اس لڑکے کی میت کو دیکھنے کے لیے تمام حوریں جنت سے ٹوٹ پڑی تھیں ان کو ہٹانے ہٹانے میں خود پسینہ سے شرابور ہو گیا۔

اس حکایت سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہیے کہ ایمان کی کیا حقیقت ہے۔ جب انسان ایمان کی حقیقت کو جان لیتا ہے تو دنیا کی ہر چیز اس کے لیے کچھ نہیں کے برابر ہے۔ جب اس لڑکے نے ایمان کی حقیقت کو جان لیا۔ تو عمر چھوٹی تھی۔ اپنے والدین سے نہ کہہ سکا نہ کچھ کر سکا، اس لیے بیماری میں مبتلا ہوا۔ والدین سے کہنے سے قاصر رہا۔ جب موت آئی تو کس شان کی موت آئی۔ دعا ہے کہ مولیٰ تعالیٰ ہر مسلمان کو حسنِ خاتمہ کی نعمت عطا فرمائے۔ آمین!

اقوالِ خلفائے راشدین

۱۔ جس میں رونے کی طاقت نہ ہو وہ روتے والوں پر رحم کیا کرے گا۔ (عثمان غنیؓ)

۲۔ آنکھیں روشن ہوں تو ہر روز، روزِ حشر ہے (علی مرتضیٰؓ)

۳۔ معافی اچھا انتقام ہے۔

۴۔ علم پیغمبروں کی میراث ہے، دولت کفار کی۔

۵۔ دوست وہی ہے جو منہ پر عیب سے واقف کرے۔

۶۔ خشوع و خضوع کا تعلق دل سے ہے نہ کہ ظاہری حرکات سے۔

۷۔ جس پر نصیحت اثر نہ کرے اس کا دل ایمان سے خالی ہے۔

حکمتِ عملی

- حیا ایمان سے ہے اور ایماندار جنت میں ہوگا۔ اور بے حیائی بد اخلاقی ہے اور بد اخلاقی کا مقام دوزخ ہے
- نادانوں کی باتوں پر تحمل، عقل کی زکوٰۃ ہے۔
- ظالم کو معاف کرنا مظلوم پر ظلم کے مترادف ہے۔
- ہر مشکل انسان کی ہمت کا امتحان لینے کیلئے آتی ہے۔
- قومیں فکر سے محروم ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں۔
- کوشش کے بغیر کامیابی کی امید فضول ہے۔
- جس راز کو دشمن سے چھپانا چاہتے ہو اس کو دوست پر ظاہر نہ کرو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
روداد
خانقاہ حضرت قطب ویلور میموریل
انوار لطیفیہ
گنٹکل

رُوئدادِ خانقاہِ حضرت قطبؒ ویلور میموریل انوارِ لطیفیہ گنتکل

شہر گنتکل، اننت پور ضلع کے قصبات میں سے ایک اہم قصبہ ہے۔ اور یہ ریلوے جنکشن ہونے کی وجہ سے ہندوستان کے قرب وجوار میں بہت ہی مشہور رہے۔ اور چینئی و ممبئی لائن میں واقع ہونے کی وجہ سے غیر معمولی شہرت کا حامل ہے۔ علمی، دینی تہذیبی وتمدنی اور ادبی اعتبار سے یہ شہر دیگر شہروں سے بہت پیچھے ہے۔ تاہم دعوت و تبلیغ اور اصلاح وارشاد کا کام کسی نہ کسی درجہ میں ہوتا رہا۔ اور وقتاً فوقتاً اس کے اطراف و اکناف سے سادات کرام ومشائخین عظام گنتکل تشریف لاتے رہے اور لوگوں کی اصلاح وتربیت اور تعلیم کا کام انجام دیتے رہے۔

خصوصاً زبدۃ العارفین وقدوۃ السالکین حضرت سید شاہ عبدالستار ہادی صاحب رحمۃ اللہ علیہ چیگری (بانیٔ خاندانِ ساداتِ چیگری) اور ان کی اولاد کی مذہبی و روحانی تعلیمات اور خدمات نے چیگری، ایرور اور اس کے قرب وجوار کے دیہات وقصبات کو اپنے دور میں بقعۂ نور بنادیا تھا اور شہر گنتکل بھی۔ آپ کی تعلیمات اور فیوضات سے مستفیض اور بہرور رہا۔ مگر ان کی وفات کے بعد اُن کی تعلیمات کو دوام واستمرار حاصل نہ ہوسکا۔

مگر قدرت کا قانون ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ رشد و ہدایت کا سلسلہ دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ جاری وساری رہے۔ اس لیے ربِّ قدیر ایک مصلح کی وفات کے بعد دوسرے مصلح کو مقررہ مقام پر روانہ فرماتا رہا ہے۔ تاکہ جو خلاء واقع ہوا ہے وہ پُر ہوجائے اور دین کی نشر واشاعت کا کام پہلے ہی کی طرح چلتا رہے۔

حضرت سید شاہ عبدالستار ہادی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد حضرت سید علی اکبر رحمۃ اللہ علیہ المعروف بہ مستان ولی رحمۃ اللہ کا گنتکل کی سرزمین پر ورود مسعود ہوا۔ آپ طبعاً مجذوب تھے۔ ہمیشہ عالم سکر میں رہا کرتے تھے۔ آپ کی محویت و استغراقیت کو لوگ پاگل پن سمجھ کر اپنے قریب آنے نہیں دیتے تھے۔ اور اپنے گھروں میں داخل ہونے سے بھی انھیں روکتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ گاؤں کے چودھری موموبوئی ریڈی اور سنکی ریڈی کے مکان کے قریب بیٹھے ہوے تھے۔ آپ کو چودھری نے اٹھواکر مکان سے دُور بٹھوادیا۔ اللہ کے ولی کے ساتھ اس حقارت آمیز رویّہ کا یہ نتیجہ ظاہر ہوا کہ اسی وقت طوفانی بارش شروع ہوگئی جو مسلسل برستی رہی۔ تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ جسے دیکھ کر ریڈی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور آپ سے معذرت چاہنے کے لیے گھر کے باہر آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ جگہ آپ تشریف فرما ہیں، اس جگہ بارش برس نہیں رہی ہے آپ کی اقامت گاہ کے ماسوا ساری زمین پر بارش برس رہی تھی۔ آپ کی اس کرامت کو دیکھ کر ریڈی حیرت زدہ رہ گیا اور آپ کا دل وجان سے معتقد ہوگیا۔ اور آج تک اس کی اولاد حضرت مستان ولی رحمۃ اللہ علیہ سے غیر معمولی عقیدت قائم کی ہوی ہے۔ اور صندل وعرس کے موقعہ پر خادموں کے دوش بدوش روضۂ مبارک پر حاضری دیتی آرہی ہے۔

حضرت مستان ولی رحمۃ اللہ علیہ کا دَور بڑا ہی پُرآشوب دَور تھا۔ جس میں بدعات و خرافات کا چلن ہر سو عام تھا۔ عوام شرک والحاد کی طرف چلی جارہی تھی۔ ایسے نازک وقت میں حضرت مستان ولی رحمۃ اللہ علیہ نے لوگوں کی اصلاح و تربیت کی جانب توجّہ مبذول فرمائی۔ آپ کی انھیں کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ مخلوقِ خدا بلا امتیاز مذہب وملّت آج بھی آپ کے دنیا سے پردہ کرنے کے باوجود آپ کے روضۂ مبارک پر حاضری دے رہی ہے اور آپ کے فیوض وبرکات سے استفادہ کر رہی ہے۔

حضرت مستان ولی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد مخلوق خدا کو تزکیۂ قلب وتصفیہ باطن کے لیے ایک اور سالکِ طریقت کی رہنمائی حاصل ہوئی۔ 1930ء کا زمانہ تھا کہ ایک متدین و متبرک ہستی لاہور سے نکل کر شمالی ہند کی دشوار گزار راہوں سے ہوتے ہوئے شہر گنتکل وارد ہوئی، جن کو لوگ آج بھی غلام شاہ قادری رحمۃ اللہ علیہ کے نام نامی اسم گرامی سے یاد کرتے ہیں۔ آپ کا حقیقی و صحیح نام حبیب الرحمٰن بتلایا جاتا ہے۔ جس وقت آپ نے پورٹرس لین کے علاقہ میں سکونت اختیار کرلی، اس وقت یہاں کی حالت بہت ہی ناگفتہ بہ تھی۔ لوگوں میں دینی و مذہبی شعور کا دُور دُور تک نام ونشان نہیں تھا۔ ایسے پُرفتن ماحول میں حضرت غلام شاہ قادری رحمۃ اللہ علیہ مسجد پورٹرس لین کی امامت وخطابت فرماتے تھے اور اس کے ساتھ دعوت وتبلیغ اور اصلاح کا کام بھی انجام دیتے تھے۔ جس کی وجہ سے یہ سارا علاقہ دینی ومذہبی ماحول کے زیرِ اثر آگیا۔ آج بھی آپ کے تربیت یافتہ لوگوں میں بعض حضرات موجود ہیں۔ جنھیں دیکھ کر ہم آپ کی کردار سازی کا اندازہ کرسکتے ہیں۔

حضرت غلام شاہ قادری رحمۃ اللہ علیہ کی دیانت داری اور پرہیزگاری کو دیکھ کر غیر مسلم اشخاص آپ سے دعاؤں کی درخواست کے لیے آپ کے دردولت پر حاضر ہوا کرتے تھے۔ اس طرح آپ کی ذات بابرکت مرجع خاص وعام بنی ہوئی تھی۔ اور ہر مذہب وملت کے لوگ آپ سے متاثر اور مانوس تھے۔ اور آپ کے روحانی فیوض وبرکات سے بہرور ہورہے تھے۔ قضا وقدر کے چنگل نے آپ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ دعوت کا کام اور اصلاح کا عمل کچھ عرصہ کے لیے معطل رہا۔ پھر قانونِ الٰہی نے اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے ایک اور شخصیت کو سرزمین گنتکل پر جلوہ گر کیا، جنھیں حضرت سید شاہ ابراہیم قادری رحمۃ اللہ علیہ بمبئی رائچوری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

آپ کے گنتکل تشریف آوری کا پس منظر بھی بڑا عجیب وغریب ہے۔ سنہ 1948ء کا دَور بڑا ہی خون آشوب تھا۔ جس کو لوگ پولیس ایکشن کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہی وہ

زمانہ تھا جب کہ نظام حیدرآباد کی بساط سلطنت الٹ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے ہر طرف سورشیں پھیلتی گئیں۔ کوئی کسی کا پرسانِ حال نہ تھا۔ اس افراتفری کے عالم میں ساداتِ اکرام و مشائخینِ عظام اپنے اپنے مستقر کو ترک کر کے جس طرف انھیں امن و امان نظر آیا اسی طرف چلدئیے۔ انھیں مشائخین میں سے ایک خانوادۂ حضرت مولانا مولوی سید شاہ ابراھیم قادری یمنی رائچوری کا بھی ہے۔ اس پُرآشوب ماحول میں حضرت یمنی صاحب نے اپنے عارضی مستقر رائچور سے ہجرت فرمائی اور مع اہل و عیال گنتکل پہنچے۔ حضرت موسیٰ صاحب، مالکِ یوسفیہ انجنیرنگ ورک شاپ سے آپ کے تعلقات پہلے ہی سے استوار تھے۔ اس لیے آپ رائچور سے براہِ راست گنتکل تشریف لاے اور یہیں بود و باش اختیار کی۔ اور اپنے بزرگوں کا علم جو انھیں وراثتاً ملا تھا، اس کی نشر و اشاعت میں لگ گئے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنی معاشی زندگی کی بحالی کے لیے جامع مسجد، اسٹیشن روڈ کے حساب و کتاب کی ذمّہ داری بھی قبول فرمائی۔ اور اس کو بحسن و خوبی سنبھالا اور زندگی کے اخیر ایام تک اس خدمت کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔

آپ کو اپنے قیام رائچور کے دوران اقطاب ویلور رحمۃ اللہ علیہم کے شجرۂ مبارکہ کو دیکھنے کا موقعہ ملا۔ جس میں یمنی مشائخین کرام کے نامِ نامی و اسمائے گرامی تھے۔ آپ بھی نسلاً یمنی نژاد تھے۔ اس لیے آپ کو اپنے شجرۂ مبارکہ کی تحقیق و تفتیش کا خیال پیدا ہوا۔ اسی جستجو نے آپ کو ویلور دارالسرور پہنچا دیا۔ اُس وقت خانقاہِ اقطابِ ویلور کی مسندِ سجادگی پر عارفِ کامل و سالک واصل حضرت مولانا مولوی سید شاہ ابوالفتح سلطان محی الدین عبدالقادر قادری ویلوری قدس اللہ سرہٗ العزیز جلوہ افروز تھے۔ حضرت سید شاہ ابراہیم قادری یمنی رحمۃ اللہ علیہ خانقاہ پہنچے اور حضرت ممدوح سے شجرۂ مبارکہ کے یمنی بزرگوں کے تعلق سے تبادلۂ خیال کیا اور معلومات اخذ کیں اور حضرت ممدوح کے دست حق پرست

پر بیعت کرتے ہوئے حضرات اقطابِ ویلورؒ کے سلسلہ میں داخل ہو گئے۔ اس طرح حضرت یمنی صاحبؒ خانقاہ اقطابؒ ویلور سے علمی و روحانی طور پہ وابستہ اور منسلک ہو گئے۔ جس کے بعد مولانا مولوی ابو الفتاح سلطان محی الدین سید شاہ عبد القادر قادری ویلوریؒ نے آپ کو خرقۂ خلافت پہنایا۔ حضرت مولانا مولوی سید شاہ ابراھیم قادری یمنیؒ خلافت سے سرفراز ہونے کے بعد سلسلۂ اقطابؒ ویلور کی تعلیمات کو گنتکل میں پھیلانے کی مہم شروع کر دی۔ ہفتہ وار اور ہر ماہ کی پہلی تاریخ میں ایک مجلس منعقد کرتے جس میں ذکرِ جہری و سری ہوا کرتا تھا اور یہ مجالس یمنی صاحبؒ کے رفقاء کے مکانات اور کبھی کسی بزرگ کے روضۂ مبارک کے صحن میں اور کبھی جامع مسجد، اسٹیشن روڈ کے اندرونی حصے میں منعقد ہوا کرتی تھیں۔

یہ مجالس بڑی مُبارک و مسعود ثابت ہوئیں اور ان کے اندر وسعت پیدا ہوتی چلی گئی اور مقامی و بیرونی اشخاص کی توجہ کا مرکز بنتی چلی گئیں اور اس طرح سے گنتکل کے اندر رشد و ہدایت کا چراغ جلنے لگا۔ حضرت ابو الفتاح صاحبؒ ۱۲ محرم ۱۳۷۸ھ کو سفر آخرت پر روانہ ہو گئے تو آپ کے برادر تقدس مآب اعلیٰ حضرت عظیم البرکت مولانا مولوی ابو النصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر قادری قبلہ مدظلہٗ العالی نے منصب سجادگی کو زینت بخشی شہر گنتکل میں اقطابؒ ویلور کی عظمت و فضیلت کی شہرت چار سو عام ہو چکی تھی۔ اس بناء پر اہل گنتکل کا رجحان اس سلسلہ میں داخل ہونے کے لیے دن بدن بڑھتا رہا حضرت موسیٰ صاحب اور دیگر معزز حضرات اعلیٰ حضرت مرحوم ابو الفتاح صاحب کی ارادت قبول کر چکے تھے۔ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت مولانا مولوی ابو النصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر قادری ویلوریؒ جوں ہی مسندِ سجادگی پر فائز ہوئے اہلیان گنتکل یکے بعد دیگرے ویلور پہنچتے رہے۔ اور بیعت و ارادت کے ذریعہ سلسلۂ اقطابِ ویلور میں داخل ہوتے رہے۔ بیعت و ارادت کا یہ سلسلہ شخصی و انفرادی حیثیت سے جاری رہنے کے علاوہ جماعت جماعت، گروہ گروہ کی

کی شکل میں بھی قائم رہا۔ مریدین و معتقدین کی کثرت نے ذکرواذکار اور تعلیم کی محفلوں میں ایک نیا رنگ پیدا کیا اور لوگوں کی دل چسپی اور توجہ اور بڑھ گئی۔

ایک مرتبہ حضرت مولانا یوسف چشتی صاحب مرحوم نے اپنے مکان پر تمام مریدانِ اقطابِؒ ویلور کو مدعو کیا اور ذکر کی مجلس کو آراستہ کیا۔ اس موقعہ پر بعض کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ ہم ایک خانقاہ تعمیر کریں۔ جہاں بیٹھ کر پوری دل جمعی و سکون کے ساتھ اپنے بزرگوں کا عطا کردہ ذکر کیا جاے۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک وفد ویلور پہنچا اور اعلیٰ حضرت ابوالنصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر قادری صاحب قبلہ مدظلہٗ العالی کی خدمتِ بابرکت میں بادب معروضہ پیش کیا کہ حضور اگر اجازت مرحمت فرمائیں تو ہم گنتکل میں اقطابِؒ ویلور کے نام پر ایک خانقاہ و مدرسہ تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ بہت اصرار کے بعد اس کی اجازت ملی۔

اس وقت خانقاہ و مدرسہ کی تعمیر کی اجازت حاصل ہونا معتقدانِ اقطابِؒ ویلور، گنتکل کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھی۔ چناں چہ مریدین نے جگہ کی تلاش شروع کی جناب تعلبند فخرالدین صاحب نے ایک جگہ کی نشاندہی کی (جہاں آج خانقاہ بنی ہوی ہے۔) جس کو سب حضرات نے بہت پسند فرمایا اور 1985ء میں پرانے گنتکل کی انجمن کے اربابِ مجاز کو 5000 پانچ ہزار روپئے نقد ادا کر کے یہ قطعۂ زمین کو حاصل کر لیا گیا۔ اور تعمیری امور کو انجام دینے کے لیے ایک انتظامیہ کمیٹی تشکیل دی گئی اور تمام مریدین اور معتقدین نے بڑے جذبہ اور شوق کے ساتھ بنائے خانقاہ میں حصہ لیا۔

اب تک مریدانِ اقطابِؒ ویلور ذکر کی مجالس مختلف مقامات پر منعقد کرتے چلے آرہے تھے اب اس عمل خیر کے لیے ایک مخصوص مقام اور ایک مخصوص عمارت حاصل ہوگئی اور دل جمعی سے ایک جگہ بیٹھ کر ذکر کرنے کا موقعہ حاصل ہوگیا۔ خانقاہ کی تعمیر کے بعد اس کے افتتاح کا مسئلہ درپیش ہوا۔

افتتاح خانقاہ

خانقاہ کی تعمیر اپنی نوعیت کے اعتبار سے اہلیانِ گنتکل کے لیے نہ صرف انوکھی تھی بلکہ منفرد بھی تھی۔ مختلف سلاسل سے وابستہ لوگوں کے درمیان یہ ایک نادر مثال قائم ہوگئی۔ کہ سلسلۂ افطابِ ویلور کے مریدین نے ذکر واذکار اور تعلیمات وارشادات اور مشاورتی امور وغیرہ کے لیے ایک مستقل خانقاہ تعمیر کرڈالی، ایک نئے عمل اور ایک نئی مثال نے لوگوں کے اندر یہ جذبہ پیدا کیا کہ اس کا افتتاح بھی عالی شان ہونا چاہیے۔ اس خیال سے ایک وفد ویلور دارالسرور پہنچا اور اعلیٰ حضرت قبلہ مدظلہٗ العالی سے افتتاح خانقاہ کی اجازت طلب کی جس کے بعد ایک تاریخ ساز اجلاس کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ پیرومرشد اپنی لامتناہی مصروفیات کے پیشِ نظر اپنے خلیفہ وجانشین ڈاکٹر ابو محمد سید شاہ محمد عثمان پاشاہ صاحب قبلہ قادری المعروف بہ فصیح پاشاہ مدظلہ العالی کو افتتاح خانقاہ کی رسم پوری کرنے گنتکل روانہ فرمایا۔ چناں چہ 1989-3-4 بروز اتوار شب کے ٹھیک ۱۰ بجے خانقاہِ قطبِ ویلور میموریل انوار اقطاب گنتکل کا افتتاح بدست جانشینِ پیرومرشد عمل میں آیا۔ اور اس موقعہ پر ایک عظیم الشان جلسۂ سیرت النبیؐ بھی بڑے ہی تزک واحتشام کے ساتھ یہاں منایا گیا۔ جس کی صدارت جانشین اقطابِ ویلور حضرت مولانا مولوی سید شاہ محمد عثمان پاشاہ صاحب قبلہ قادری مدظلہٗ العالی نے کی۔ خانقاہ کا افتتاحی اجلاس آپ اپنی مثال تھا۔ جس کے شکریہ کی رپورٹ کی تلخیص یہاں پیش کی جارہی ہے۔

الحمد للہ وکفی، والصلوۃ والسلام علے عبادہ الذین اصطفی!

اما بعد! فقد قال اللہ تبارك وتعالیٰ فی کلامہ المجید والفرقان الحمید لئن شکرتم لأزیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی لشدید وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ۔

برادرانِ ملّتِ اسلامیہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

یہ اللہ رب العزت کا ہم پر احسانِ عظیم ہی ہے کہ اس نے ہماری تعمیر خانقاہ کی دیرینہ خواہش کو بحسن وخوبی پایۂ تکمیل تک پہنچایا جس کے لیے ہم تمام خالق حقیقی ومعبود حقیقی کا جس قدر بھی شکریہ ادا کریں کم ہے۔

حاضرین! سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ جو انسان کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ کا بھی شکریہ ادا نہیں کرتا۔ اس ارشاد گرامی کے پیشِ نظر میں تمام ارادت مندانِ اقطابِ ویلور، گنتکل کی جانب سے آپ تمام حاضرین کا شکریہ ادا کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ جو اس خانقاہ کی افتتاحی وجلسۂ سیرت النبی صلے اللہ علیہ وسلم کی تقریب میں شریک ہیں۔

سب سے پہلے میں صدر محترم عزت مآب حضرت مولانا مولوی ابو محمد سید شاہ محمد عثمان پاشاہ صاحب قبلہ قادری دامت برکاتہم العالیۃ وخلیفہ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت ابو النصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر صاحب قبلہ دامت برکاتہم العالیۃ کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنھوں نے شیخ المشائخ، معارف اسرار وحقائق، آفتابِ شریعت ومہتاب طریقت تقدس مآب اعلیٰحضرت عظیم البرکت مولانا مولوی ابو النصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر قادری صاحب قبلہ مدظلہ العالی سجادہ نشین خانقاہِ قطبؒ ویلور کے حکم پر اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود ہماری دعوت پر گنتکل تشریف لائے اور خانقاہ کا افتتاح فرمایا۔ اور جلسہ میں شرکت فرمائی۔

ومہمان خصوصی پیر طریقت ورموز کان معرفت حضرت علامہ مولانا مولوی سید شاہ فقیر باشاہ صاحب قادری پرنسپال ڈاکٹر مولوی عبد الحق یونانی میڈیکل کالج کرنول کا بھی تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اپنے سارے مشاغل کو ترک کر کے ہماری دعوت پر حاضر ہو کر جلسہ میں شرکت فرمائی اور ہمیں اپنے نیک ومفید مشوروں سے

سے نوازتے ہوئے یہاں ایک عربی، ناظرہ قرآن خوانی کا مدرسہ قائم کرنے کی ہدایت بھی فرمائی۔

افضل العلماء مولانا مولوی حافظ بشیر الحق صاحب قریشی لطیفی، استاذ دارالعلوم لطیفیہ، مکان حضرت قطبؒ ویلور کا بھی بے حد ممنون و مشکور ہوں کہ انھوں نے دور دراز مقام سے سفر کی مشقت برداشت کرتے ہوئے یہاں حاضری دی اور اپنے خطاب مستطاب سے محظوظ فرمایا اور ڈاکٹر سید شاہ عبدالرحیم قادری صاحب، یونانی میڈیکل آفیسر ساکن کدری کا بھی بہت ممنون و مشکور ہوں جنھوں نے اس مبارک محفل میں شرکت فرماکر ہمیں تشکریہ کا موقعہ عنایت فرمایا۔

اور حضرت مولانا مولوی یوسف چشتی صاحب قبلہ ملیباری کا بھی تشکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنھوں نے نہ صرف یہاں شرکت فرمائی بلکہ ذکر و اذکار کے سلسلہ میں ہمیشہ آپ نے ہماری رہ نمائی فرمائی۔ اس موقعہ پہ یہ ناسپاسی ہوگی اگر میں ڈاکٹر الحاج مولانا مولوی سید شاہ محمد اسمٰعیل پیر صاحب قبلہ قادری شرفی سجادہ نشین طاہر گلشن، کرنول کی کاوشوں و نیک مشوروں کا اعتراف نہ کروں، جنھوں نے اس جلسہ کی کارروائی کے سلسلہ میں پورا پورا تعاون فرمایا اور مفید مشوروں سے نوازا۔ آپ کی خدمات اہلیانِ گنتکل کے لیے کس قدر قابلِ قدر ہیں، اس کا اظہار اور اعتراف ایک اخلاقی تقاضہ ہے۔ اس موقعہ پر "مشتے نمونہ از خروارے" کے مصداق اس کا ایک مختصر خاکہ یہاں پیش کر رہا ہوں۔

1984-11-26 کا دور اہلِ گنتکل کے لیے سماجی، اصلاحی، تہذیبی و تمدنی اعتبار سے نہ صرف اہمیت کا مالک ہے، بلکہ یہ دور علمی اعتبار سے نہایت ہی ترقی کا دور تھا۔ کیوں کہ یہ وہی زمانہ تھا، جس میں حضرت مولانا مولوی الحاج سید شاہ محمد اسماعیل پیر صاحب قبلہ قادری سجادہ نشین طاہر گلشن کرنول، یونانی میڈیکل آفیسر کی حیثیت سے گنتکل تشریف لائے اور اپنی انسانی خدمات اور اپنے اخلاق کریمانہ کی وجہ سے عوام الناس کا دل موہ لیا۔ آپ کا شفاخانہ لوگوں کے لیے جسمانی امراض کے علاج کا مرکز تھا تو دوسری طرف روحانی اعتبار سے ان کی تسکین

کا ذریعہ بنا ہوا تھا۔ آپ علاج و معالجہ کے ساتھ اصلاح و تعلیم کا عمل جاری رکھے ہوے تھے۔
1987ء میں مسجد مومن آباد کی تعمیرِ جدید کا سنگ بنیاد آپ ہی کے ہاتھوں رکھا گیا۔ اور آپ ہی نے بعض اہلِ خیر کے تعاون سے اس کی تکمیل فرمائی۔ اس کے علاوہ یہاں کی کئی اور مساجد کے بنانے میں آپ کی کوششوں کا بالواسطہ اور بلاواسطہ عمل دخل رہا ہے۔

آپ کا ایک اور وصف جو قابل ذکر ہے وہ یہ کہ حضرت موصوف کے گنتکل تشریف لانے سے پہلے یہاں وعظ و نصیحت کی محفلیں و مجالس منعقد تو ہوا کرتی تھیں مگر اس کا وجود نہ ہونے کے مترادف تھا۔ آپ کے قدوم میمنت سے یہ جمود ختم ہو گیا اور ہر محلہ و مسجد میں آئے دن بیانات ہونے لگے اور یہاں منعقد ہونے والی تمام مجالس میں آپ خطاب فرماتے تھے جس سے باشندگان گنتکل کی علمی و دینی حالت میں کافی سدھار آنے لگا۔

حضرت موصوف جب تک گنتکل میں اقامت گزیں رہے لوگ آپ کے مخلصانہ اوصاف کے سبب سماجی و معاشرتی بلکہ نجی معاملات میں بھی آپ سے صلاح و مشورہ کیا کرتے تھے اور آپ ہی کے فرمان عالی شان کے مطابق اس پر عمل بھی کرتے تھے۔
1994ء میں جب آپ کا تبادلہ بنگلور کے لیے ہوا تو آپ نے اپنے تعلقات کو شہر سے منقطع نہیں فرمایا بلکہ حسب سابق اپنے خدماتی روایات کو برقرار رکھا۔ اس کی ایک جیتی جاگتی مثال مدرسۂ طاہریہ کی شکل میں ایک عالیشان عمارت پورٹرس لین میں موجود ہے۔ اللہ رب العزت آپکی ذات بابرکت کے ذریعہ ان خدمات کا سلسلہ تادیر قائم و دائم رکھے۔ آمین!
خصوصیت کے ساتھ میں پرانے گنتکل کے ارکینِ انجمن کا بیحد ممنون و مشکور ہوں کہ جنہوں نے خانقاہ کی تعمیر کے لیے زمین کا حصّہ عنایت فرمایا، جس کی وجہ سے آج ہم یہاں یہ تقریبات منارہے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی اس نوع کی دیگر تقریبات اور مجالس منعقد ہوتی رہیں گی۔ آخیر میں ایک اور بار میں ان تمام مندوبین و مشائخین و عمائدینِ شہر اور مقامی و بیرونی علماء و فضلاء اور عوام الناس کا تشکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے جلسہ کی رونق بڑھائی اور اس کو کامیاب بنانے میں ہماری مدد فرمائی۔

تشکریہ
نیازمند حکیم شیخ منان
و مریدین و معتقدینِ اقطاب ویلور۔ گنتکل

ختم قادریہ کا آغاز

مریدانِ اقطابؒ ویلور کے ذکر واذکار کی خبر بعض مخصوص حضرات تک پہنچ گئی جن میں سے ایک بزرگ شخصیت حضرت مولانا مولوی سید شاہ فقیر پاشاہ صاحب قبلہ قادری کی بھی تھی۔

ایک مرتبہ حضرت موصوف گنتکل میں اپنی دختر نیک اختر کے مکان تشریف لائے جہاں آپ نے ارادتمندانِ اقطابؒ ویلور کی ذکر کی مجلسوں کا تذکرہ سنا تو آپ نے ذکر کی مجلس میں شرکت کی خواہش ظاہر کی چنانچہ آپ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ایک ذکر کی مجلس منعقد کی گئی اس میں آپ نے شرکت فرمائی اور اس موقعہ پر آپ نے ذکر کا انداز وآدابِ مجلس اور اس کے طور وطریقوں کو دیکھا تو بڑی مسرت اور خوشی کا اظہار فرمایا اور بہ نفسِ نفیس اعلیٰ حضرت عظیم البرکت مولانا مولوی ابوالنصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر صاحب قبلہ قادری مدظلہ العالی سے اہلِ گنتکل کے لیے ذکرِ ختم قادریہ کی اجازت طلب فرمائی۔ پیرو مرشد نے اجازت مرحمت فرمائی اور فقیر پاشاہ صاحب قبلہ مدظلہ العالی کو ہدایت دی کہ وہ اس کے طریقۂ کار سے مریدانِ گنتکل گنتکل کو واقف کرائیں اور اس سے متعلقہ امور کو سمجھائیں۔ چناں چہ حضرت ممدوح نے مریدانِ اقطابِ ویلور کو اس کی تعلیم دی اور اس کی عملی مشق کروائی۔

اللہ ربّ العزت حضرت ممدوح کو اس عملی وعلمی تربیت کی جزا عطا فرمائے آمین ثم آمین

اُس وقت سے لے کر آج تک ہر ماہ کی دس یا سولھویں تاریخ کو خانقاہ میں یہ ختم قادریہ پابندی کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔

ان شاء اللہ المستعان آیندہ بھی یہ سلسلہ جاری وساری رہے گا۔

تمت بالخیر •

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روئداد

دار العلوم

فیضانِ لطیفیہ

گنتکل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روئداد

دارالعلوم فیضانِ لطیفیہ گنتکل

الحمدللہ یہ شرف صرف اہل گنتکل کے مریدان اقطابِ ویلور رحمۃ اللہ علیہم ہی کو حاصل ہوا ہے کہ انھوں نے ذکر کی مجالس کو یکسوئی کے ساتھ ادا کرنے کے لیے یہاں اپنے بزرگانِ دین کے نام پر ایک بہت ہی موزوں و مناسب انداز میں اپنی ایک خانقاہ تعمیر فرمائی ہے اور جس میں پابندی کے ساتھ اُس وقت سے لے کر آج تک ذکرواذکار کی مجلس ومحفل ہر ماہ چاند کی دس یا سولہ تاریخ کو منعقد ہورہی ہے۔ اس روحانی تربیت گاہ میں ایک مدرسہ ناظرہ قرآن خوانی کے لیے خصوصی اعتبار سے پرانے گنتکل کے طلبہ وطالبات کے لیے کھول دیا گیا ہے۔ جسے دیکھ کر حاجی پیراں صاحب مرحوم، مالک حاجی پیراں ورک شاپ نے اس کے لیے مومن آباد مسجد کے قریب ایک قطعۂ ارضی کو دو حصّوں میں تقسیم کر کے ایک حصّہ مریدانِ اقطابِ ویلور کو عطا کیا۔ یقیناً اس مخلص و خیرخواہ انسان کی عطا کا یہ وقت بڑا ہی مبارک ومسعود تھا کہ اس زمین سے متصل دوسرے پلاٹ بھی فروخت ہونے لگے، تو اس وقت ایک اور مخیّر وخیرخواہ انسان سنار محمد عباس صاحب نے یہ زمین خریدنے کے لیے معتقدانِ اقطاب ویلور کو توجّہ دلائی۔ چوں کہ اس وقت رقم ان حضرات کے پاس موجود نہیں تھی، اس لیے خود عباس صاحب

نے قرض حسنہ کے طور انھیں رقم عنایت کی اور یہ زمین انھیں دلوادی ۔ گویا کہ اس وقت معتقدانِ اقطابِ ویلور کے پاس جملہ چار پلاٹ جمع ہو گئے اور مریدین حضرات میں مختلف تصوّرات پیدا ہونے لگے ۔ بعض حضرات کا خیال یہاں شادی خانہ بنانے کا تھا اور بعض حضرات اس سلسلہ میں متفق تھے ۔ مریدین کی جماعت پیر و مرشد اعلیٰ حضرت ابو النصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر قادری قبلہ مدظلہٗ العالی کی بارگاہ میں ویلور پہنچی اور اس زمین پہ شادی خانہ بنانے کا منصوبہ پیش کیا ۔ جس کو پیر و مرشد نے آئندہ آنے والے فتنوں و مصائب و آلام کی خبر دیتے ہوئے شادی خانہ بنانے کے خیال کو ناپسند فرمایا ۔ اس منصوبہ کی تنسیخ کے بعد یہ زمین کچھ دنوں تک ایسی ہی پڑی رہی جس پر لوگ اپنے گھروں کا کوڑا کرکٹ ڈالنے لگے اور بعض غیر مسلم اس جگہ کو اپنا مسکن و رہائش گاہ کے طور پر استعمال کرنے لگے اور یہ سلسلہ ایک زمانۂ دراز تک چلتا رہا بتاریخ 1994-11-2 کو پیر و مرشد اعلیٰ حضرت سید شاہ محمد باقر صاحب قبلہ قادری کے پردہ فرمانے کے بعد پھر سے اس زمین کو بروے کار لانے کا خیال مریدین کے دل میں پیدا ہوا ۔ راقم الحروف سے جب اس سلسلہ میں پوچھا گیا ، تو میں نے عرض کیا ہمیں چاہیے کہ اس سلسلہ میں اپنے بزرگوں کے عمل کو دیکھیں کہ انھوں نے کس انداز سے اپنے مقام شہر ویلور میں تعمیرات کو بنوایا ہے ۔ جہاں ایک خانقاہ ہے جس کے ساتھ ایک مسجد اور اسی کے ساتھ ایک کوہ پیکر عظیم الشان دینی درسگاہ دار العلوم لطیفیہ نامی تاریخی عمارت جلوہ نما ہے ۔ گویا یہ عمارتیں اس انداز سے بنائی گئی ہیں کہ جہاں جسمانی و روحانی دونوں طرح سے علاج و معالجہ کا انتظام ہو جائے اور تعلیم و تذکیر کے ساتھ تزکیہ و تطہیر کا عمل بھی جاری و ساری رہے ۔ ؎

خوشا مسجد و مکتب و خانقاہے
کہ دروے بود قیل و قال محمدؐ

لہٰذا ہمیں بھی اپنے مرشدین کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے یہاں ایسی ہی تعمیرات کرنی چاہیے۔ جب ہمارے پاس خانقاہ موجود ہے اور مسجد بھی اپنی جگہ یعنی مسجدِ مومن آباد ہمارے بالکل قریب ہے۔ اب صرف ایک کمی رہ گئی ہے، وہ ہے مدرسہ کی تعمیر! بہتر ہوگا کہ یہاں اس جگہ پر ایک درس گاہ کی تعمیر کی جائے تاکہ اصل (ویلور) و نقل (گنتکل)، دونوں میں یکسانیت و موزونیت و مطابقت پیدا ہو جائے چناں چہ اس کے بعد مریدین کی ایک جماعت ویلور پہنچ کر تقدس مآب ڈاکٹر ابو محمد سید شاہ محمد عثمان پاشاہ قادری، سجادہ نشین اقطاب ویلور سے مدرسہ کی تعمیر کی اجازت حاصل کرلی اور تاریخِ سنگ بنیاد بھی مقرر کرکے گنتکل لوٹ آئی۔

دارالعلوم فیضانِ لطیفیہ، گنتکل کا سنگِ بنیاد

مریدین و معتقدین اس تاریخ کا بہت ہی بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ وہ نیک ساعتیں آخیر آہی گئیں۔ 16؍ نومبر 1994ء بروز اتوار علی الصباح بذریعہ تروپتی پاسنجر عزت مآب مولانا مولوی ڈاکٹر ابو محمد سید شاہ عثمان پاشاہ صاحب المعروف بہ فصیح پاشاہ صاحب قبلہ قادری، سجادہ نشین اقطاب ویلور و ناظم دارالعلوم لطیفیہ، ویلور، حضرت مکان قطب ویلور، گنتکل تشریف لائے اور ٹھیک 30-11 بجے ریلوے کمیونٹی ہال میں اپنے ایک مرید جناب محمد صادق صاحب کی دخترِ نیک اختر کی تقریب نکاح میں شرکت فرمائی۔

آپ کے علاوہ فضیلت مآب ڈاکٹر الحاج مولانا مولوی سید شاہ محمد اسماعیل پیر صاحب

قادری سجادہ نشین طاہر گلشن کرنول بھی اس محفلِ نکاح میں شریک تھے۔

اس تقریب سے فراغت کے بعد پیرومرشد نے تمام دن جمیع مریدین و معتقدین کو نصیحت فرماتے ہوئے خانقاہ میں گزارا۔ دوسرے روز یعنی بروز پیر 17-11-1994 کو حضرت ممدوح نے بعض مریدین و معتقدین کے مکانات کو تشریف لے گئے۔ جہاں اُن کے لیے خیر و برکت کی دعا فرماتے ہوئے خانقاہ لوٹ آئے۔ عصر کا وقت قریب آنے لگا۔ آپ عصر کی نماز مسجد مومن آباد میں ادا کرنے کے لیے تشریف لائے بعد فراغتِ نماز پیرومرشد حضرت مولانا مولوی سید شاہ محمد عثمان پاشاہ صاحب قبلہ قادری و ڈاکٹر الحاج سید شاہ محمد اسماعیل پیر صاحب قادری سجادہ نشین طاہر گلشن کرنول نے اپنے مقدّس ہاتھوں سے دارالعلوم فیضانِ لطیفیہ گنتکل کا سنگِ بنیاد رکھا۔ پیرومرشد نے دارالعلوم کی تعمیری و تعلیمی ترقی کے لیے دعائے خیر فرمائی اور ڈاکٹر صاحب نے تمام مریدین و معتقدین کو نصیحت فرماتے ہوئے اتحاد و اتفاق سے رہنے کی تعلیم و تلقین فرمائی۔ سرِ مغرب جلسہ کی کارروائی اختتام پذیر ہوئی۔ اسی کے ساتھ پیرومرشد ویلور کے لیے عازمِ سفر ہوگئے۔

پیرومرشد کے ہاتھوں سنگِ بنیاد کی رسم انجام پانے کے بعد مدرسہ کی تعمیرات کی کارروائیاں شروع ہوگئیں۔ اہلِ گنتکل اور اس کے قرب و جوار کے لوگوں سے کافی تعاون حاصل ہوا اور مدرسہ کی عمارت 9-5-1998 میں مکمل بھی ہوگئی۔ منصوبہ تو ایک منزلہ عمارت کے بنانے کا مگر بزرگانِ اقطابؒ ویلور کی نگاہ کرم کی بدولت عمارت دو منزلہ بن گئی۔

یقیناً وہ دن ہم سب مریدین و معتقدین کے لیے بڑا ہی مسرور و شادمانی کا باعث تھا، جس دن مدرسہ کی تعمیر اپنے تکمیل کے مراحل کو پہنچ چکی تھی۔ اسی کے ساتھ مدرسہ کے اربابِ مجاز نے اس کے افتتاح کا منصوبہ بھی بنایا کہ اس کا افتتاح بڑے ہی اعلیٰ

پیمانہ پر پیرو مرشد کے دستِ فیضِ رساں سے عمل میں لانا چاہیے۔

چناں چہ 98ء-4-25 بروزِ ہفتہ، رات کے ٹھیک دس بجے، احاطۂ دارالعلوم فیضانِ لطیفیہ، نزدِ مومن آباد، گنتکل میں نہایت تزک و احتشام کے ساتھ اس مدرسہ کی افتتاحی تقریب عمل میں آئی۔ جس کی روداد ذیل میں درج کی جا رہی ہے۔

دارالعلوم فیضانِ لطیفیہ کا افتتاح

اس افتتاحی جلسہ کا آغاز حافظ ہارون رشید صاحب، ادونی کی قرأتِ قرآن پاک سے ہوا۔ اور نعتِ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بارگاہِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش کرنے کی سعادت حضرت مولانا مولوی سید شاہ یوسف باشاہ صاحب قبلہ قادری ہادی نے حاصل کی۔ استقبالیہ و رسم گلپوشی کے ساتھ ہی کنوینر جلسہ مولانا مولوی سید شاہ یوسف باشاہ صاحب ہادی اسمائے مقررین میں سے افضل العلماء مولانا مولوی سید شاہ عبدالستار صاحب ہادی و قادری کو تقریر کرنے کے لیے مدعو کیا۔ حضرت قبلہ نے دورانِ تقریر مسلمانوں کو خدمتِ خلق کی طرف توجّہ دلاتے ہوے کہا کہ آج دنیا میں یہود و نصاریٰ ایک تنظیم کے ساتھ عوام کی مفت خدمت کرتے ہوے انھیں تعلیمی و میڈیکل اور دیگر رفاہِ عام کی سہولتیں فراہم کر رہے ہیں اور انھیں امور کی وجہ سے وہ اپنی قوم کو ترقی کے بامِ عروج پر پہنچا رہے ہیں۔ جب کہ یہ امور سرورِ عالمؐ نے اپنی امّت کو عطا کیا تھا، تاکہ وہ اس کو انجام دے۔ مگر انھوں نے ترک کیا، غیروں نے اپنا کر تمام دنیوی ترقی کو اپنے قابو میں کر لیا۔

اور مولانا مولوی حافظ بشیر الحق صاحب لطیفی نے علم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوے کہا کہ تعلیمی میدان میں جب تک ادب کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا، اس وقت تک علم کا حصول ناممکن نہ سہی دشوار ضرور ہے۔

اور مولانا مولوی سید شاہ ابوالحسن مرشد پیر صاحب قبلہ قادری ادونی نے طلبا کو

نصیحت فرماتے ہوئے کہا کہ علم حاصل کرنے کے ساتھ صحیح عقائد کا حاصل کرنا بہت ضروری ہے

اور مہمانِ خصوصی مولانا مولوی قاضی سید شاہ اعظم علی صوفی صاحب قبلہ حیدر آبادی نے دورانِ تقریر طلبار کو نصیحت فرماتے ہوئے کہا کہ وہ علمِ دین کے ساتھ علم دنیا بھی حاصل کریں۔ خصوصیت کے ساتھ انگریزی، حساب، سائنس کا علم، جس پر دنیا کی ترقی کا انحصار ہے۔ اس کا حصول ہر طالب علم کے لیے اس دور کی ضرورت ہے۔

اور صدرِ محترم الحاج ڈاکٹر سید شاہ محمد اسماعیل پیر صاحب قبلہ قادری مدظلہ العالی سجادہ نشین کرنول نے اپنے دورانِ تقریر علم کی اہمیت و فضیلت کو اجاگر کرتے ہوئے جہاں طلبار کو محنت و مشقت سے تعلیم حاصل کرنے کی تلقین فرمائی ہے، وہیں اراکینِ مدرسہ کو اتحاد و اتفاق کے ساتھ رہنے اور آئندہ مدرسہ کی ترقی کے لیے کوشش کرتے ہوئے مدرسہ کو ترقی کے بامِ عروج پر پہنچانے کی طرف توجہ دلائی۔

آپ کے بعد پیرِ طریقت حضرت مولانا مولوی سید شاہ ابو محمد عثمان پاشاہ صاحب قبلہ قادری، سجادہ نشین اقطابِ ویلور کی نصیحتوں و دعائیہ کلمات پر جلسہ کی کارروائی اختتام پذیر ہوئی۔

آخیر میں حافظ محمد ابراہیم لطیفی مہتمم دارالعلوم فیضانِ لطیفیہ نے آئے ہوئے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اور کنوینر جلسہ مولانا مولوی سید شاہ یوسف باشاہ صاحب ہادی قادری صاحب کے صلوٰت و سلام پر جلسہ کا اختتام ہوا۔

اسی افتتاحی جلسہ کے ساتھ الحمد للہ اس میں تعلیمی سلسلہ کا آغاز بھی ہو گیا اس وقت تک مدرسہ کی کوئی مستقل آمدنی نہیں تھی۔ صرف لوگوں کے مالی تعاون پر چلتا رہا اراکینِ مدرسہ نے مدرسہ کی بقا اور اس کی ترقی کے پیش نظر ایک مستقل آمدنی کا ذریعہ بنانے کا خیال کیا۔ تاکہ مستقبل میں مدرسہ کی تعلیم و تعلم میں کوئی حرج پیدا نہ ہو۔ چناں چہ مدرسہ سے متصل کچھ زمین خالی تھی۔ جس پر پانچ مکانات بنائے گئے۔ منصوبہ تو اسی حد تک

تھا۔ مگر شانِ کریمی و فیضان اقطابِؒ ویلور کہیے کہ یہ عمارت دو منزلہ سے سہ منزلہ بن گئی اور آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ بھی بن گیا۔

مدرسہ کی ترقی کے پیش نظر اب یہ خیال کیا جا رہا ہے کہ ضلع اننت پور میں اہلِ سنّت والجماعت کا کوئی ایسا ادارہ نہیں ہے، جہاں صحیح عقائد کے ساتھ قرآن و حدیث کی تعلیم کا انتظام ہو۔ جہاں جاکر تشنگانِ علومِ نبوت اپنی علمی تشنگی کو بجھا سکے۔ اس لئے اراکینِ مدرسہ یہیں شعبۂ حفظ کے ساتھ شعبۂ عالم بھی قائم کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہاں سے بھی فیضانِ اقطابِؒ ویلور علم کی شکل میں عام ہوتا چلا جائے۔ اور جو آمدنی کا ذریعہ شروع ہو چکا ہے اس کا کما حقہٗ صرفہ بھی ہوتا رہے۔

ویسے الحمدللہ اس سال 2002 - 2001 کے دوران دارالعلوم فیضانِ لطیفیہ سے دو طالب علم ۱۔ عزیزی خواجہ بندہ نواز گنتکلی۔ ۲۔ شیخ محی الدین نے شعبۂ حفظ سے فراغت حاصل کر لی۔ جنھیں پیر و مرشد نے ۲۰ر شوال المکرم ۱۴۲۲ھ بمطابق ۵ر جنوری ۲۰۰۲ء کے سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد کے موقعہ پر اپنے دست مبارک سے سندِ حفظ عنایت فرمایا۔ اس نعمت کے حصول پر جس قدر بھی اللہ رب العزت کا شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ اس جلسہ کی مختصر سی روئداد ذیل میں درج کی جا رہی ہے۔

جلسۂ تقسیم اسناد برائے حفّاظ
2001 - 2002

۱۰ر شعبان المعظم کی تاریخ دارالعلوم لطیفیہ ویلور کے ابنائے قدیم کے لیے ہمیشہ ایک یادگار تاریخ رہی ہے۔ جس میں شرکت کرنے کے لیے سبھی ابنائے قدیم اطراف واکناف سے ویلور چلے آتے ہیں اور یہاں جمع ہو کر تھوڑی دیر کے لیے ماضی کی یادوں میں کھو کر ان گزرے ہوئے لمحوں کی مسرور کن بہاروں کی یاد تازہ کرتے ہوئے اپنے اپنے مستقر کو لوٹ آتے ہیں۔

ہمیشہ کی طرح جب ۱۰؍شعبان المعظم ۱۴۲۲ھ کو ویلور پہنچا علی الصباح پیرومرشد اپنی خانقاہ میں تشریف لائے اور میں یعنی حافظ محمد ابراہیم لطیفی، مہتمم دارالعلوم فیضانِ لطیفیہ، گنتکل، ناظمِ دارالعلوم لطیفیہ ویلور سے دارالعلوم فیضانِ لطیفیہ کی کارکردگی کو بتلاتے ہوئے، گنتکل میں تقسیم اسناد کے جلسہ و تاریخ کی اجازت چاہی۔ حضور والا نے ۲۰؍شوال المکرم کی تاریخ عطا فرماتے ہوئے اجازت مرحمت فرمادی۔

بتاریخ ۲۰؍شوال المکرم ۱۴۲۲ھ بمطابق ۵؍جنوری ۲۰۰۲ء بروز ہفتہ رات ٹھیک 9.30 بجے زیرِ صدارت تقدس مآب پیرِ طریقت ڈاکٹر مولانا مولوی ابو محمد سید شاہ محمد عثمان پاشاہ صاحب قبلہ قادری، سجادہ نشین انقطاب ویلور، بمقام احاطہ دارالعلوم فیضانِ لطیفیہ، گنتکل جلسہ منعقد ہوا اور جلسہ کا آغاز حافظ ذاکر حسین ادونی کی قرأتِ کلام پاک سے ہوا اور نعت شریف عزیزی محمد امتیاز سلمہٗ نے پڑھی۔

اسی کے ساتھ کنوینر جلسہ مولانا مولوی سید یوسف صاحب ہادی صاحب نے اپنی دورانِ تقریر مدارس کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ مدارس دین کے قلعے ہیں جہاں سے دین کے سپاہی تیار ہوکر عوام کی خدمت کے لیے نکلتے ہیں۔ یہیں سے امن و آشتی کے پیغام کو عام کیا جاتا ہے۔

مولانا مولوی سید قادر باشاہ صاحب قادری سجادہ نشین چیگری نے جلسہ میں عوام سے خطاب فرماتے ہوئے طلباء کو بھی یہ بات ذہن نشین کرانے کے لیے کہا کہ صحیح تعلیم کے ساتھ اس دَور میں صحیح عقائد کی بھی ضرورت ہے۔ اس لیے طلباء کو چاہیے کہ اس کا ضرور خیال رکھیں۔

اور افضل العلماء مولانا مولوی حافظ بشیر الحق صاحب لطیفی لکچرار دارالعلوم لطیفیہ ویلور نے اپنے خطاب مستطاب میں عوام کو نصیحت فرماتے ہوئے کہا کہ آج کل علمِ دین سے طلباء کا ذوق وشوق کم ہوتا ہوا نظر آرہا ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں اپنے بزرگانِ دین کی کی تاریخ سے سبق سیکھنا چاہیے۔

عزت مآب الحاج ڈاکٹر سید شاہ محمد اسماعیل پیر صاحب قادری سجادہ نشین طاہر گلشن کرنول نے علم دین کی فضیلت کو بیان فرماتے ہوئے عوام کو نصیحت فرمایا کہ عوام کو چاہیے کہ اس کی طرف توجہ فرمائیں اور اپنے بچوں کو علمِ دین کے زیور سے آراستہ کریں۔
اور فضیلت مآب پیر طریقت حضرت مولانا مولوی سید شاہ ابوالحسن مرشد پیر صاحب قبلہ قادری سجادہ نشین درگاہِ حضرت محبوبؒ پیر حسینی ادونی نے اپنے خطاب مستطاب میں قرآن فہمی کے اصول سے عوام الناس کو روشناس کروایا۔

اور صدر محترم حضرت مولانا مولوی سید شاہ ابو محمد عثمان پاشاہ صاحب قبلہ قادری سجادہ نشین افطابؒ ویلور نے اپنے خطاب میں عوام سے اور خصوصی اعتبار سے مریدین و معتقدین سے کہا کہ بیعت وارادت کے تقاضوں کو پورا کرو اور ہمیشہ اتحاد واتفاق سے مل جل کر سارے امور کو انجام دیتے رہو۔ اس لیے کہ اتحاد واتفاق ہی انسانیت کے لیے کامیابی اور نجات کی ضمانت ہے۔

اور آخر میں مہتمم دارالعلوم فیضانِ لطیفیہ حافظ محمد ابراہیم لطیفی وجمالی نے سب سے جلسہ کو تشریف لائے ہوئے مہمانوں کا فرداً فرداً شکریہ ادا کیا اور خصوصیت کے ساتھ دارالعلوم کے ان تمام اراکین کا بھی شکریہ ادا کیا جنھوں نے جلسہ کو کامیاب بنانے میں پورا پورا تعاون کیا۔ اس ہدیۂ تشکر کے ساتھ مولانا مولوی سید یوسف پاشاہ صاحب قادری کے صلوٰۃ و سلام پر جلسہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

مولائے کریم کی بارگاہ میں دست بہ دعا ہوں کہ سجادہ نشین اقطابؒ ویلور کی سرپرستی میں دارالعلوم فیضانِ لطیفیہ دن بہ دن ترقی کی راہ پر گامزن رہے اور اس کا فیضان ابدالآباد تک جاری وساری رہے! آمین ثم آمین!!

اور مدرسہ کے جملہ کارکنان وخدمت گزار حضرات اور معاونینِ کرام اور وہ افراد جنھوں نے دامے، درمے، سخنے ہمارا تعاون فرمایا اللہ تعالے ان تمام کی عمروں میں برکت عطا فرمائے!!

اسلام میں تعلیم مساوات

سیّد خلیل احمد قادری متعلم دارالعلوم لطیفیہ۔ حضرت مکان ویلور

اسلام کا آفتاب چمکنے سے دُنیا شخصی استبداد کے عذاب میں گرفتار تھی اور ہر شخص نے اس بات کو فراموش کردیا تھا کہ انسان انسان مساوی الرتبہ ہیں۔ ہر جگہ اور ہر مقام پر صرف فرمانروایان ملک، امرائے شہر اور روسائے قبائل ہی ہر قسم کی عظمت و عزّت کے مالک بنے ہوئے تھے اور غریبوں کی زندگی کا مقصد صرف یہ تھا کہ سرمایہ داروں کی اطاعت کے لیے وقف ہوجائیں۔ ہر دولت مند آدمی خواہ وہ کتنا ہی نالائق اور بدکار کیوں نہ ہو محض اپنے مال و زر کی وجہ سے ہر عیب سے مبرّا اور ہر ہنر سے متصّف سمجھا جاتا تھا اور ہر غریب آدمی خواہ وہ کتنا ہی نیک اور پرہیزگار کیوں نہ ہو محض اپنی بے سروسامانی کی وجہ سے حقیر نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

ان حالات میں حق سبحانہٗ وتعالےٰ کی غیرت کو حرکت ہوی اور آقائے نامدار حضور سرور کائنات سرکار دوعالم صلے اللہ علیہ وسلم جلوہ افروز ہوے۔ آپؐ نے اپنی خداداد قوت سے شخصیت پرستی کی بُنیادیں ہلادیں اور شخصی استبداد کا تختہ الٹ دیا۔ فرمانروایانِ ملک اور امرائے شہر کو مرتبۂ الوہیت سے گراکر عام انسانی سطح پر کھڑا کردیا۔ اور غریبوں کو خاکِ ذلت سے اٹھاکر تاج و تخت کی مالک شخصیتوں کے پہلو بہ پہلو کھڑا کردیا۔ حضورؐ اکرم نے سب کو اپنے پروردگار کا یہ حکم سنایا: بےشک اللہ تعالےٰ کے نزدیک تم میں سے زیادہ بزرگ وہ ہے جو اخلاقِ حسنہ سے متصف ہے۔ حضور اکرمؐ کی اس صدائے حق سے عالم کا گوشہ گوشہ گونج اٹھا اور انسانی جبّاریت کا طلسم ٹوٹ گیا۔ حاکم و محکوم، ادنیٰ و اعلیٰ اور بلند و پست سب ایک سطح پر آگئے۔ اور مساوات کی روشنی تمام دُنیا میں پھیل گئی۔

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے انتہائی استقلال کے ساتھ اس حقیقت کو مسلسل ظاہر فرمایا ہے کہ اسلام کی نظر میں آقا و غلام، ادنیٰ و اعلیٰ سب برابر ہیں۔ اگر ان میں کوئی چیز وجہ امتیاز ہوسکتی ہے تو صرف تقویٰ، حسن عمل اور حسنِ اخلاق

ہے۔ ایک مشہور خطبہ میں حضور نے ارشاد فرمایا ہے ، تمام انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور حضرت آدم مٹی سے بنائے گئے تھے ۔ اس لیے سب انسان آپس میں برابر ہیں ۔ تمام تاریخی شواہد سے یہ بات ثابت ہے کہ اسلام ہی نے دُنیا کو شخصی استبداد کے عذاب سے نجات دی اور حقوق میں مساوات کا پہلو نمایاں کیا۔ اب ذرا اس بات پر غور کیجیے کہ اسلام کے سچّے فرزندوں نے کس طرح اس قانون کی پابندی کی اور کس طرح دُنیا میں مساواتِ حقوق کی روشنی پھیلائی ۔

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہٗ جب خلیفہ ہوے تو سب سے پہلے خطبہ میں ارشاد فرمایا : بھائیو! میں تمہارا خلیفہ مقرّر ہوا ہوں ۔ لیکن میں اقرار کرتا ہوں کہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں ۔ اگر میں ٹھیک کام کروں تو میری متابعت کرو اور اگر میں غلط راستہ اختیار کروں تو تم مجھے سیدھا کر دو ۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہٗ نے اپنے زمانۂ خلافت میں ایک جرم کی بناء پر اپنے بیٹے عبداللہؓ کو سزا دی ۔ یہاں تک کہ شدّتِ تکلیف سے اُن کا انتقال ہو گیا ۔ اس موقعہ پر ایک شخص نے حضرت عمر فاروقؓ سے کہا : آپؓ خلیفۂ وقت ہیں ۔ آپؓ حضرت عبداللہؓ کو اتنی شدید سزا کیوں دی ۔ اُن کا قصور معاف کیوں نہ کر دیا ! حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا : اسلام کے قانون میں رشتہ اور غیر رشتہ قریب و بعید کا کوئی امتیاز نہیں ہے ۔ سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے : اللہ کے مقرّر کئے ہوے آئین و قوانین دُور و قریب ، رشتہ دار و غیر رشتہ دار سب پر یکساں جاری کرو اور خدا کے معاملہ میں تم ملامت کرنے والوں کی ذرّہ برابر بھی پروا نہ کرو ۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہٗ نے ایک دن کسی بات پر ناخوش ہو کر اپنے خادم عوف بن سعدؓ کے کان کھینچ دیے ۔ جس سے انھیں اس قدر تکلیف ہوی کہ بے اختیار اُن کی چیخ نکل گئی ۔ اُن کی درد بھری آواز سُن کر حضرت عثمانؓ متاثر ہوے اور آپؓ نے اُن سے کہا : بھائی ! مجھ سے غلطی ہوی کہ میں نے تم کو اتنی سخت سزا دی ۔ خدا کے واسطے تم مجھ سے اپنا بدلہ لے لو ۔ خادم نے خاموشی اختیار کی ۔ لیکن امیر المؤمنینؓ کا اصرار برابر جاری رہا اور آخر انھوں نے آپؓ کے کان پکڑ کر چھوڑ دیے ۔

جب حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ خلیفہ ہوے تو خلافت کی وجہ سے آپؓ کی طرزِ زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا حسبِ عادت سادگی کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے ۔ حضرت عبداللہ ابنِ عمرؓ بیان کرتے ہیں : خلیفہ ہونے کے بعد حضرت علیؓ ہم لوگوں میں اس طرح رہا کرتے تھے گویا وہ بھی ہم میں سے ایک ہیں ۔ ان کے عہدِ خلافت کا ایک واقعہ یہ ہے ۔ کہ وہ ایک مرتبہ

سیر و تفریح کے لیے شہر سے باہر تشریف لے گئے۔ ان کا لباس اس قدر سادہ تھا کہ کوئی شخص ان کو گورنر یقین نہیں کر سکتا تھا۔ ایک شامی تاجر نے اُن کو مزدور سمجھ کر آواز دی اور کہا: "ذرا شہر تک یہ سامان لے چلو۔" آپؓ نے اس کا سامان سر پر رکھ لیا۔ جب اہلِ شہر نے تعظیم کے ساتھ آپؓ کو سلام کرنا شروع کیا تو وہ تاجر متعجب ہوا اور اس نے ایک شخص سے دریافت کیا کہ یہ کون ہیں؟ اس شخص نے کہا: یہ ہمارے شہر کے گورنر ہیں۔ یہ سن کر وہ شرمندہ ہوا اور اس نے آپؓ سے معافی مانگی۔ آپؓ نے فرمایا: کچھ فکر نہ کرو، میں تو تمہارا خادم ہوں۔

نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں۔ ساری مخلوق اور سارے لوگ اللہ کا کنبہ ہے۔ جو شخص بھی اس کے عیال کے ساتھ حسنِ سلوک کرے گا وہ اللہ کی نظروں میں محبوب اور پسندیدہ ہو جائے گا۔

لہٰذا ہر مسلمان کا یہ اخلاقی اور دینی فریضہ ہے کہ وہ سارے انسانوں کے ساتھ حسنِ اخلاق کا نظّارہ کرے۔ جو مظاہرہ کہ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا تھا۔ حتٰی کہ آپؐ نے یہاں تک فرمایا: بعثت لاتمم مکارم الاخلاق: میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاق کی تعلیم عام کر دوں۔ ...

• آخری سفر کا بقیہ' صفحہ نمبر 145 سے آگے۔

نوٹ: آپ کا سفر کامیاب ہونے کے لیے اچھے اعمال کیجیے: ؎

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

•

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں!
سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں
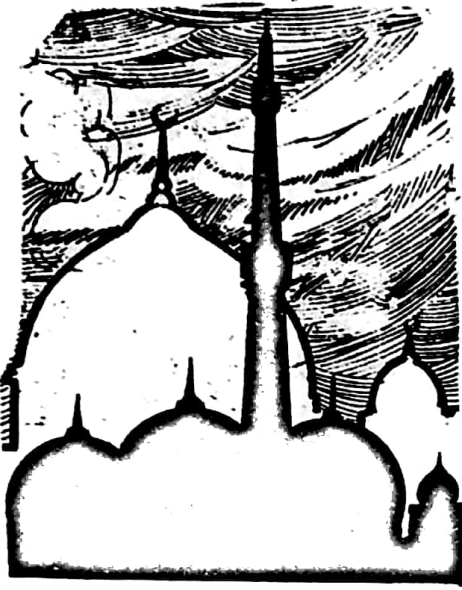
ایم سید احمد تنجاوری: زمرۃ السابعہ: دار العلوم لطیفیہ، مکانِ حضرتِ قطبؒ، ویلور

تقلید کا مادہ قلادہ ہے۔ قلادہ کے معنے پٹّے کے ہیں۔ بابِ تفعیل میں جاکر اس کے معنے گلے میں پٹّہ ڈالنے کے ہوگئے اصطلاح شرع میں تقلید کے معنے یہ ہیں: تسلیم قول الغیر بلا دلیل: دوسرے کی بات بلا دلیل مان لینا۔ اسی کو علامہ سہمودی نے عقد الفرید میں بیان فرمایا ہے:

التقلید قبول القول بأن یعتقد من غیر معرفة دلیل: کسی کی بات دلیل جانے بغیر اس طرح مان لینا کہ اس پر اعتماد جم جائے۔ دلیل کے ذریعہ کسی بات کے حق کا اعتقاد ہو تو یہ تقلید نہیں بلا دلیل محض قائل کے ساتھ حسنِ ظن کی بناء پر اس کی کہی ہوئی بات پر اعتقاد جم جائے کہ یہ شخص اعلیٰ درجہ کا دین دار، صادق و امین علوم و فنون کا ماہر و فائق ہے۔ اس لیے جو بات کہتا ہے وہ حق ہے یہی تقلید ہے۔ معمولاتِ شرعیہ سے قطع نظر کرتے ہوئے جب ہم روزمرّہ کے حالات اور اپنی طرزِ زندگی پر نظر کرتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ ہم اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں تقلید کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس میں عوام و خواص، شہری، دیہاتی ہر طبقہ کے لوگ مساوی حصہ دار ہیں۔ آپ غور کریں!

ایک بچّہ ہوش سنبھالتے ہی اپنے ماں باپ، مُربّی کی تقلید کے سہارے پروان چڑھتا ہے۔ ایک بیمار اپنے معالج کی تقلید ہی کرکے شفایاب ہوتا ہے۔ ایک مستغیث کسی قانون داں وکیل کی تقلید کرکے ہی اپنا حق پاتا ہے۔ راستے سے نابلد ایک راہ رو کسی راستہ بتانے والے کی تقلید کرکے ہی منزلِ مقصود تک پہنچتا ہے۔ ایک ناخواندہ اپنے معلّم کی تقلید

ہی سے صاحبِ علم وفضل بنتا ہے۔

مکتب میں ایک بچہ گیا۔ معلم نے بچے کو ایک حرف پر انگلی رکھ کر بتایا کہ 'یہ "الف" ہے۔ بچے نے بلا دلیل مان لیا کہ یہ الف ہے۔ دوسرے حرف پر انگلی رکھ کر معلم نے بچے سے کہا "با"، بچہ بلا بحث اسے مان لیا کہ یہ 'با' ہے۔ کبھی کسی بچے نے اپنے استاد سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ کیوں پہلے والے حرف کو 'الف' اور دوسرے کو 'با' کہتے ہیں؟ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر بچہ اس کیوں اور کیوں کر کے چکر میں پھنسا تو اصل تعلیم سے بھی محروم ہو جائے گا۔

ایک مستغیث وکیل کے ہاں جاتا ہے اپنا مدعا بیان کرتا ہے۔ وکیل اسے مشورہ دیتا ہے کہ وہ تعزیراتِ ہند کی فلاں دفعہ کے تحت دعویٰ کرے۔ مستغیث بلا چون وچرا وہی کرتا ہے۔ اسی کا نام تقلید ہے۔ ایک مریض معالج کے یہاں گیا۔ اس نے مرض کی تحقیق کر کے اس کے لیے ایک نسخہ لکھا۔ دُنیا کا کوئی مریض حکیم یا ڈاکٹر سے یہ بحث نہیں کرتا کہ میری بیماری کا نسخہ یہی کیوں ہے؟ یہ دوائیں کس طرح میرا مرض دور کریں گی؟ جو مریض اس بحث میں پڑا وہ اچھا ہو چکا! آپ ایک مسافت طے کر رہے ہیں، ایک چوراہے پر پہنچ کر حیرت زدہ ہو کر کھڑے ہو گئے کہ اب دائیں جائیں کہ بائیں؟ یا سیدھے آگے چلا چلوں؛ اچانک کوئی مقامی آدمی آگیا، آپ اس سے سوال کرتے ہیں، فلاں جگہ کونسا راستہ جائے گا؟ وہ جدھر بتاتا ہے آپ اس کی کورانہ تقلید کرتے ہوئے بلا دلیل اسی راستے پر چل کھڑے ہوتے ہیں۔

اب آپ حضرات غور کریں اگر ہم تقلید کو اپنے تمدن سے نکال دیں ہماری معیشت کی گاڑی ایک انچ آگے نہیں چل سکے گی۔ ہم اپنی زندگی کے گوشہ گوشہ میں تقلید کے محتاج ہیں اور یہ احتیاج قوم کے ہر فرد کو عام ہے جس طرح ایک جاہل بیماری میں ڈاکٹر کا، قانونی ضرورت میں وکیل کا، راستہ نہ معلوم ہونے کی صورت میں رہنما کی تقلید کا محتاج ہے ایک عالم بھی اور جس طرح ایک دیہاتی خورد ونوش، بول چال، تعلیم وتربیت میں اپنے ماں باپ، استاد کا مقلد ہے، اسی طرح ایک شہری بھی۔

اب اگر تقلید کو ہم اپنے تمدن سے نکال دیں تو ہماری زندگی مفلوج ہو کر رہ جائے گی۔ غور کریں اگر ہمارا معالج کے نسخہ کو استعمال کرنے سے پہلے نسخہ کے رموز سمجھنے کے لیے بحث شروع کر دے۔ شرح اسباب وعلاماتِ قرابادین ومعالجاتِ نفسی کے اسباق پڑھنے لگے تو وہ اچھا تو کیا ہوگا، البتہ جلد ہی دوسرے عالم کا سفر کر دے گا۔ یونہی ایک مستغیث وکیل سے قانون کی ل م سمجھے بغیر دعویٰ نہ کرے گا تو اس کا حق مل چکا جب تک وہ ایل ایل بی کے نصاب پڑھنے کے لائق ہوگا۔ دعویٰ کی معیاد بھی ختم ہو جائے گی۔ اس لیے ہر متمدن انسان کا اس پر اجماع ہے کہ جس

فن کا انسان ماہر نہ ہو اس میں کسی ماہرِ فن کی تقلید کرے۔ اسی لیے ہر فرد بشر کسی نہ کسی دوسرے فرد بشر کی کسی نہ کسی معاملہ میں تقلید کرتا ہوا دیکھا جاتا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ تقلید ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہے اور بغیر تقلید کے زندگی بسر کرنا ناممکن ہے۔

جس طرح اپنی زندگی کے معمولات میں تقلید سے مستغنی نہیں ہو سکتے اسی طرح دینی معاملات میں بھی تقلید سے مفر نہیں۔ اس لیے امت کا اس پر اجماع ہے کہ تقلید فرض ہے۔

اس لیے کسی بھی دیندار یا مدعی دینداری کی یہ ہمت نہیں کہ وہ تقلید کی فرضیت سے انکار کر سکے۔ معاملہ یہ ہے کہ اگر تقلید کو فرض قرار نہ دیں تو پھر دین پر عمل معتذر اور شدید معتذر ہو جائے گا۔

اس کا بیان یہ ہے کہ ہم کو اللہ عزوجل اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی اطاعت اور اتباع کا حکم دیا ہے اور اتباع و اطاعت موقوف ہے قرآن و احادیث کے حصول پر۔ نہ صرف حصول بلکہ یہ بھی جاننے پر کہ ان میں کون ناسخ ہے کون منسوخ، کون خاص ہے کون عام ہے، کون خفی، کون نص، کون مفسر ہے، کون مجمل، کون محکم ہے، کون متشابہ وغیرہ وغیرہ۔ سینکڑوں باتیں ایسی ہیں کہ جب تک انسان ان سب پر کامل عبور کر کے قرآن و حدیث سے مسائل کے استنباط و استخراج پر کامل دستگاہ نہ رکھے قرآن و حدیث پر عمل ناممکن ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں: سورۂ بقرہ کے تیسویں[۳۰] رکوع کی آیت ۲۳۴ کی ابتداء میں ہے۔

والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجًا یتربصن بانفسھن اربعۃ اشھرٍ وعشرا : اور تم میں جو مریں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن روکے رہیں۔ اس کے بعد اسی سورہ کے اکتیسویں[۳۱] رکوع کی آیت ۲۴۰ کی ابتداء میں ہے والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجًا وصیۃ لازواجھم متاعًا الی الحول غیر اخراجٍ ۔ اور تم جو مریں اور بیبیاں چھوڑ جائیں تو ان کے لیے وصیت کر جائیں کہ ان کو سال بھر کا نان و نفقہ دیا جائے اور گھر سے نہ نکالا جائے۔

ایک ہی سورہ ایک ہی پارہ میں متصلاً ایک ہی مسئلہ کے بارے میں دو مختلف احکام ایسے مذکور ہیں کہ ان دونوں کو پڑھ کر آدمی چکرا جائے کہ وہ کس پر عمل کرے۔ پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بیوہ کی عدت چار مہینے دس دن ہیں اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بیوہ کی عدت ایک سال ہے۔ عربی زبان کا ماہر، پروفیسر عربی پر کتنا ہی عبور رکھتا ہو! کس آیت پر عمل کرنا چاہیے؛ بتا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اور آگے بڑھیے ان دونوں آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ بیوہ خواہ حاملہ ہو غیر حاملہ اس کی عدت چار مہینے دس دن یا ایک سال ہے۔ مگر

سورۂ طلاق میں حاملہ عورتوں کی عدت کے بارے میں فرمایا گیا : سورۂ طلاق کی درمیانی آیت[۴] میں ہے۔

واولات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن: اور حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنا حمل جن لیں۔

ایک نقطہ پر آکر سورۂ بقرۃ اور سورۂ طلاق کی آیتوں میں شدید تعارض ہے۔ ایک شخص مرا، اس کی بیوی حاملہ ہے تو اس کی عدت کیا ہوگی؛ چار مہینے دس دن یا ایک سال یا وضع حمل۔

اور سُنتے چلیے اسی سورہ بقرۃ کے بائیسویں رکوع میں ہے؛ آیت نمبر ۱۸۰۔

کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرًا الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف حقًا علی المتقین:

تم پر فرض کیا گیا کہ جب تم میں سے کسی کو موت آئے اگر وہ کچھ مال چھوڑے تو وہ ماں باپ اور قریب کے رشتہ داروں کے لیے وصیت کرے پرہیزگاروں پر واجب ہے۔

لفظ اقربین عام ہے۔ اولاد، بھائی، بہن، دادا، دادی وغیرہ سب کو شامل ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ شریعت نے کسی کا کوئی حصّہ مقرر نہیں فرمایا ہے۔ یہ مورث کے صوابدید پر ہے۔ جس کے لیے جتنا چاہے وصیت کر جائے۔ اس کی وصیت کے مطابق رشتہ داروں حتیٰ کہ ماں باپ کو بھی حصّہ ملے گا۔ مگر سورہ نساء کا دوسرا رکوع تلاوت کریں۔ اس میں ماں باپ، میاں بیوی، بیٹی بیٹا، پوتا پوتی وغیرہ کے شرعی سہام کی تعین تفصیل کے ساتھ کی گئی ہے۔ عربی زبان کا کوئی کتنا ہی ماہر کیوں نہ ہو محض زبان دانی سے وہ اس گتھی کو ہرگز ہرگز نہیں سلجھا سکتا۔

یہ چند مثالیں میں نے قرآن مجید سے تقریب فہم کے لیے پیش کر دی ہیں۔ اگر استقصا کیا جائے تو ایک دفتر تیار ہو جائے۔ احادیث میں اس قسم کے اشکالات کی کوئی کمی نہیں۔ اب اگر تقلید کو درمیان سے نکال دیا جائے تو فرض عین کہ ہر مسلمان ان تمام تفصیلات کو جانے جن سے اس قسم کے اشکالات حل ہو سکیں۔ اب اگر ہر مسلمان کو ان تمام تفصیلات کے جاننے کا مکلّف کیا جائے تو......

اولاً۔ یہ ممکن نہیں کہ ہر مسلمان کو ان تمام تفصیلات حاصل کر سکے جو مجتہدین کے لیے ضروری و لازم ہیں۔

ثانیاً۔ اگر بالفرض یہ تمام علوم حاصل ہو جائیں تو تفقہ فی الدین جو خالص خداداد اور وھبی صلاحیت ہے سب کو بلکہ اکثر کو کہاں نصیب۔ تفقہ فی الدین ایک الگ نعمت ہے جو ہر حافظ صاحب کو نہیں ملتی۔ اسی لیے ایک

حصے

جلیل القدر محدّث نے فرمایا ہے: الحدیث مضلۃ الا للفقہاء۔

اور حضرت امام اعمش قدس سرہ نے بڑی صفائی اور دیانت داری کے ساتھ حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ کے تفقہ فی الدین کا اعتراف کرتے ہوئے خود امام صاحب سے فرمایا:

نحن الصیادلۃ وانتم الاطباء: ہم دوا فروش ہیں اور تم لوگ طبیب ہو۔

ثالثاً۔ چلیے تفقہ فی الدین بھی حاصل ہو گیا اور وہ تمام علوم وفنون جو لوازم اجتہاد میں حاصل ہو جائیں تو دینداری اور للّٰہیت کا آج کتنا فقدان ہے۔

اُمّت کے عام افراد کو تقلید کے بغیر چارہ نہیں۔ اس لیے کہ اگر تقلید کو بدعتِ سیّئہ و حرام قرار دے دیا جائے تو پھر قرآن اور حدیث پر عمل کرنا سوائے معدودے چند حضرات کے اُمّت کے اکثر بلکہ پورے افراد کو محال ہو جائے۔ پھر لازم یہ کہ پوری اُمّت کو قرآن وحدیث پر عمل کا مکلّف کرنا وسعت سے زیادہ تکلیف دینا ہوا جو نصِ قرآنی لایکلف اللہ نفساً الا وسعہا کے صریح منافی ہے۔ لاجرم اُمّت کے دو گروہ ہوئے ایک مجتہدین دوسرے غیر مجتہدین۔ غیر مجتہدین کو حکم دیا گیا کہ دینی معاملات میں مجتہدین کی طرف رجوع کریں اور اُن کا اتباع کریں۔ ارشاد ہے: فاسئلوا اھل الذکران کنتم لاتعلمون: اہلِ علم سے پوچھو جب کہ تم میں علم نہیں

اس آیت کے مخاطب غیر اہلِ علم ہیں اور اہلِ ذکر سے مراد اہلِ علم اور سوال سے مقصود اہلِ اسلام کے ارشاد پر اتباع کا لازم ہونا ہے۔ اب یہ بھی طے ہو گیا کہ اہلِ ذکر سے خاص مجتہدین مراد ہے۔ پس جب کہ یہ نصِ قرآنی سے ثابت ہے کہ غیر اہلِ ذکر پر اہلِ ذکر کا اتباع واجب ہے اور فریقین اس بات پر متفق ہیں کہ اہلِ ذکر سے مجتہدین مراد ہے تو ثابت ہو گیا کہ غیر مجتہد پر مجتہد کی اتباع واجب ہے یہی تقلید ہے۔

اس لیے کہ اگر مجتہد کی اتباع واضح دلیل کے بعد ہوگی تو یہ مجتہد کی اتباع نہ ہوی بلکہ اپنی تحقیق پر عمل ہوا۔ اس لیے مجتہد کی اتباع تقلید میں منحصر ہے۔

اُمّت کا اس پر اجماع ہے کہ اب ہر شخص کو خواہ عالم ہو، غیر عالم، واجب ہے کہ وہ ائمۂ اربعہ سے کسی ایک کی جملہ اُمور فقیہہ میں تقلید کرے۔

علامہ سید احمد طحطاوی رحمہ حاشیۂ درمختار میں فرماتے ہیں:

فعلیکم یامعشر المؤمنین باتباع الفرقۃ الناجیۃ المسماۃ باھل سنت والجماعۃ فان

نصرۃ اللہ تعالیٰ وحفظہ وتوفیقہ فی موافقتھم وخذلانہ وسخطہ ومقتہ فی مخالفتھم وھذہ الطائفۃ الناجیۃ قد اجتمعت الیوم فی المذاھب الاربعۃ ھم الحنفیون والمالکیون والشافعون والحنبلیون ومن کان خارجًا من ھذہ المذاھب الاربعۃ فھو من اھل البدعۃ والنار۔

(کتاب غنیۃ الطالبین)

ترجمہ: اے مومنو! تم پر فرقۂ ناجیہ اہل سنّت والجماعت کی اتباع لازم ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد اور حفظ و توفیق ان کی موافقت میں ہے اور اس کی ناراضگی اور عذاب ان کی مخالفت میں ہے اور فرقۂ ناجیہ نے آج اس پر اجماع کرلیا ہے کہ وہ صرف مذاہب اربعہ حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی ہیں۔ جو ان چاروں سے خارج ہوگا وہ بدعتی جہنمی ہے۔

امام الائمہ شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی "عقد الجید" میں لکھتے ہیں:

مذاہب اربعہ کے اختیار کرنے میں عظیم مصلحت ہے اور اُن سے اعراض کرنے میں بھاری فساد ہے۔ ہم ان کو چند طریقے سے بیان کرتے ہیں۔

اول یہ کہ اُمّت نے اجماع کرلیا ہے کہ شریعت کی معرفت میں سلف پر اعتماد کیا جائے۔ تابعین نے اس معاملہ میں صحابہ پر اعتماد کیا اور تبع تابعین نے تابعین کرام پر۔ اسی طرح ہر طبقہ میں علماء نے اپنے پہلے والوں پر اعتماد کیا۔ اس کی اچھائی پر عقل دلالت کرتی ہے اس لیے کہ شریعت نقل اور استنباط کے بغیر نہیں پہچانی جا سکتی۔ اور نقل نہیں درست ہوگی مگر اسی طرح کہ ہر طبقہ اپنے پہلے والوں سے متصلاً حاصل کرے اور استنباط کے لیے ضروری ہے کہ متقدمین کے مذاہب کو جانا جائے تاکہ ان اقوال سے باہر نہ جائیں کہ خرقِ اجماع ہوجائے۔ اور انھیں اقوال کی بنیاد بنایا جائے اور اگلوں سے اس میں مدد لی جائے۔ اس لیے کہ تمام صنعتیں مثلاً سناری، طب اور شعر اور لوہاری اور تجارت اور رنگ ریزی کسی کو بھی میسر نہیں ہوئی مگر اس کے ماہرین کے ساتھ کام کرنے سے اور بغیر اس کے بہت نادر جو واقع نہیں اگرچہ عقلاً جائز ہے اور جب یہ متعین ہوگیا کہ (شریعت کی معرفت) سلف کے اقوال ہی پر اعتماد ہے تو ضروری ہے کہ ان کے وہ اقوال جن پر اعتماد ہو۔ اسناد صحیح کے ساتھ مروی ہوں یا مشہور کتابوں میں مدون ہو اور یہ کہ منقح ہوں کہ محتملات میں راجح مرجوح سے ظاہر ہو اور عام تخصیص مذکور ہو۔ متضاد اقوال میں تطبیق ہو۔ احکام کی علتیں بیان کی گئی ہوں ورنہ ان پر اعتماد صحیح نہیں اور زمانہ میں کوئی مذہب اس صنعت کے ساتھ موصوف نہیں۔ سوائے ان چار مذاہب کے۔

مذکورہ بالا عبارتوں سے مندرجۂ ذیل فوائد حاصل ہوئے۔

۱۔ فرقۂ ناجیہ صرف اہل سنت والجماعت ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے تمام فرقے خواہ وہ اپنا نام کچھ رکھیں بدعتی ہیں۔

۲۔ اس پر اجماع ہے کہ تقلید شخصی واجب ہے۔

۳۔ تقلیدِ شخصی میں عظیم مصلحت ہے اور اس کے ترک میں فسادِ کبیر ہے۔

۴۔ شریعت کی معرفت نقل اور استنباط پر موقوف ہے اور یہ دونوں سلف کے اقوال جاننے پر موقوف ہے۔

۵۔ سلف میں صرف ائمۂ اربعہ کے اقوال اسناد صحیح کے ساتھ مروی ہیں اور صرف انھیں کے مذہب منقح ہیں۔

۶۔ سلف میں سے ائمۂ اربعہ کے علاوہ دوسرے مجتہدین کے اقوال نہ تو اسناد صحیح کے ساتھ مروی ہیں نہ کتب مشہورہ میں جامعیت کے ساتھ مدون ہیں کہ ان پر اعتماد صحیح ہو اور منقح ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مجتہدین میں سے صرف ائمۂ اربعہ ہی کے مذاہب لائق اعتماد و قابل عمل ہیں اور یہی علت ہے ان میں سے کسی ایک پر عمل کے وجوب پر اجماع ہے۔ اور اہلِ علم کا اجماع خواہ کسی عصر کا ہو حجت شرعی ہے اس لیے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا تجتمع امتی علی الضلالۃ: میری امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی۔

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدیٰ ویتبع غیر سبیل المومنین نولہ ما تولّٰی ونصلہ جھنم وساءت مصیرًا: سورہ نساء: ۱۱۵

اور جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف کرے اس کے بعد کہ حق کا راستہ اس پر ظاہر ہو چکا اور مسلمانوں کے راستے سے الگ راستہ چلے ہم اس کے حال پر چھوڑ دیں گے۔ اور اسے دوزخ میں داخل کریں گے اور یہ کیا ہی بری جگہ پلٹنے کی ہے۔

لہٰذا اس میں شک وشبہ نہ رہا کہ اس عصر میں واجب ہے کہ ائمۂ اربعہ میں کسی ایک امام کی تقلید کی جائے۔ ان کے علاوہ دوسرے اماموں کی تقلید ممنوع ہے۔ اس لیے کہ ان کے مذاہب اتنے احتیاط اور جامعیت کے ساتھ آج موجود نہیں کہ ان کا اتباع کیا جاسکے۔ رہ گئی ایک صورت یہ کہ ائمۂ اربعہ میں کسی معین کی تقلید نہ کی جائے بلکہ بعض مسائل میں ایک کی بعض میں دوسرے کی۔ اس میں کیا حرج ہے!

پہلا حرج یہی ہے کہ یہ خرق اجماع ہے۔ اجماع اس پر ہے کہ جو جس امام کا مقلد ہو جملہ امور میں اس کی تقلید کرے۔ بعض مسائل میں ایک کی بعض مسائل میں دوسرے کی' یہ ناجائز اور گناہ ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ حقیقت میں امام کی تقلید نہ ہوی اپنے نفس کی تقلید ہوی۔ اس لیے کہ دوسرے امام کی تقلید ایک امام سے عدول کرکے دوسرے امام کی طرف رجوع کی بنیاد کیا ہوگی؟ اپنے پسند کے کچھ مسائل میں امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا اجتہاد پسند آیا تو اُسے اختیار کیا

اور بعض دوسرے مسائل میں امام شافعیؒ یا کسی اور امام کا اجتہاد پسند آیا تو اُسے اختیار کرلیا۔ یہی تو ہوائے نفس کی پیروی ہے۔ اور اگر یہ اعراض دلیل کی قوت وصنف کی بنا پر ہو تو یہ تسلیم بہ قول بلا دلیل نہ ہوا با دلیل ہو پھر تقلید نہ رہی اور کلام تقلید میں ہے۔

تیسرا حرج یہ ہے کہ یہ نص قرآنی سے حرام ہے کہ کبھی ایک طریقہ اختیار کیا جائے، کبھی دوسرا۔ ہم کو حکم ملا ہے کہ ہم ایک ہی راستہ کو اختیار کریں اور اسی کی پیروی کریں، چند راستے کا اتباع نہ کریں فرمایا گیا۔

ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیله

چند راستوں پر مت چلو ورنہ اس کے راستے سے ہٹ جاؤ گے

یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ اگر کہیں چند راستے گئے ہوں تو منزل پر وہی پہنچے گا جو ان میں کسی ایک کو اختیار کرے اور جو کبھی ایک راستہ پر، کبھی دوسرے پر، پھر تیسرے پر، پھر چوتھے پر، پھر پہلے پر اور پھر دوسرے پر علی ھذا القیاس چلتا رہے گا۔ وہ راستہ ناپتا ہی رہ جائے گا، منزل تک ہرگز نہیں پہنچے گا۔

اس لیے آج واجب ہے کہ جو حنفی ہے، وہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی اور جو شافعی ہے وہ امام شافعیؒ کی، جو مالکی ہے وہ امام مالکؒ کی، جو حنبلی ہے وہ امام احمد بن حنبلؒ کے جملہ فقہی مسائل میں تقلید کرے۔ اُمت کے کسی فرد کو ان کے علاوہ کسی مجتہد کی تقلید جائز نہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقہ وطفیل سے ہم کو صحیح معنوں میں مقلد بنا دیں اور دنیا وآخرت کی فلاح وبہتری نصیب فرمائیں آمین بجاہ سید المرسلین •••

آخری سفر
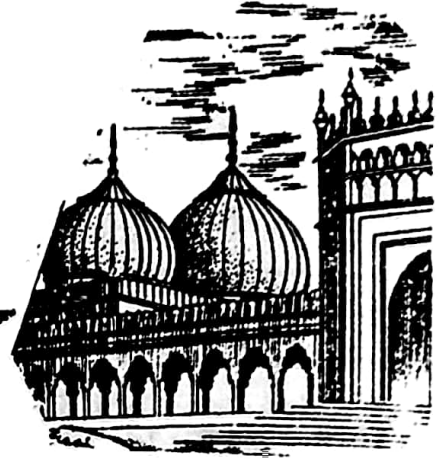
شاہ نواز عرف محمد سلیم باشاہ تنجاوری
متعلم دارالعلوم لطیفیہ: مکان حضرت قطب ویلور

یہ آخری سفر غور و فکر کے لیے ہے لطف و مذاق کے لیے نہیں ہے!

مسافر کی کیفیت

نام : آدم کی اولاد

پیدائش : مٹی

پتہ : دُنیا

سفر کی کیفیت

ابتداءِ سفر: دُنیا

انتہائے سفر: آخرت

وقتِ سفر: نہ معلوم

پہنچنے کا دن: نہ معلوم

سفر کی تیاری

۱۔ اللہ پر ایمان رکھنا اور اس کے حکموں کو ماننا۔

۲۔ ہر وقت موت کو یاد رکھنا۔

۳۔ یقین رکھنا کہ آخری ٹھکانا: جنّت یا دوزخ ہوگا۔

۴۔ کپڑے، مال اور روزی سب حلال ہونا۔

منظرِ سفر

۱۔ جنازے کا صندوق۔

۲۔ مسجد۔

۳۔ قبرستان۔

۴۔ میدانِ محشر۔

۵۔ جنّت یا دوزخ۔

سفر کے ضروری اشیاء : ۱۔ دو میٹر سفید کپڑا۔ ۲۔ اچھے اعمال۔ ۳۔ صالح اولاد۔ ۴۔ صدقۂ جاریہ

نوٹ: مندرجہ بالا چیزوں کے علاوہ کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں۔

مسافر کے لیے آگاہی اور تنبیہہ: آپ کا سفر یقینی ہے۔ ریزرویشن کرنے کی ضرورت نہیں۔

مزید معلومات: اللہ کے کلام اور احادیث نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھیں۔ (بقیہ صـ136 پر)
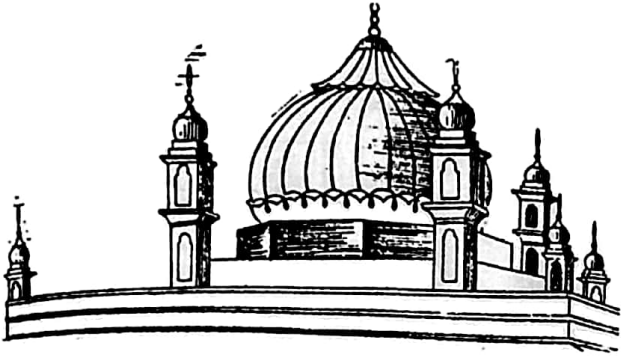
عیادت

حدیث کی روشنی میں

ایم اے، محمد حنیف ویلوری متعلم دار العلوم لطیفیہ، حضرت مکان ویلور

قربان جائیے اس دینِ مبین پہ اور کروڑوں دُرود و سلام ہوں اس رہبر ہادی صلے اللہ علیہ وسلم پر جس نے عالَم انسانیت کو جاہلیت کی تاریکیوں سے نکال کر اسلام کی منوّر شاہ راہ پر گامزن فرمایا۔

جس نے عیادت جیسے عمل کو بھی بڑی عبادت بنا دیا۔ عیادت کا مفہوم عربی زبان میں صرف مزاج پرسی ہی نہیں بلکہ اس میں خبر گیری کا مفہوم بھی شامل ہے۔ یہ باہمی تعاون اور غم خواری کے جذبہ کو اُبھارنے کا ایک اہم ترین ذریعہ ہے۔ بلکہ یہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان بھائی پر حق ہے اور اللہ تبارک وتعالےٰ سے محبت کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ جو اللہ تبارک و تعالےٰ سے تعلق رکھنے والا ہو وہ اللہ تعالےٰ کے بندوں سے ہرگز بے تعلق نہیں ہو سکتا۔

مریض کی غم خواری، دردمندی اور تعاون سے غفلت برتنا دراصل اللہ تعالےٰ سے غفلت برتنا ہے۔

نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: کہ قیامت کے روز اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرمائے گا:

اے آدمؑ کے بیٹے! میں بیمار پڑا، لیکن تو نے میری عیادت نہیں کی؟ بندہ عرض کرے گا: اے میرے پروردگار، تو ساری کائنات کا رب ہے، بھلا میں تیری عیادت کیسے کرتا؟ اللہ تبارک و تعالےٰ ارشاد فرمائے گا: میرا فلاں بندہ فلاں وقت بیمار تھا، تو نے اس کی عیادت نہیں کی۔ اگر تو اس کی عیادت کو جاتا تو مجھے وہاں پاتا۔ یعنی تو میری خوشنودی اور رحمت کا مستحق قرار پاتا۔ (مسلم)

بیمار کی حقیقی اور اصلی عیادت یہ ہے کہ اگر وہ غریب اور نادار ہو تو اُس کے علاج کے لیے دوا وغیرہ کا انتظام کیا جائے۔ یا پھر مریض غریب تو نہیں ہے لیکن وقت پہ دوا وغیرہ لانے اور پلانے کے لیے کوئی تیماردار نہ ہو تو اس کا معقول انتظام کیا جائے۔

ایک موقعہ پر سرکارِ دوعالم سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کے چھ

حقوق ہیں۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیا حقوق ہیں! آپؐ نے ارشاد فرمایا!
۱۔ جب تم اپنے مسلمان بھائی سے ملو تو اس کو سلام کرو۔ (۲) جب وہ تمہیں دعوت کے لیے مدعو کرے تو تم اس کی دعوت کو قبول کرو۔ (۳) جب وہ تم سے کسی نیک مشورہ کا طالب ہو تو اسے نیک مشورہ دو۔ (۴) جب کسی کو چھینک آئے اور وہ الحمد للہ کہے تو اس کے جواب میں یرحمك اللہ کہو۔ (۵) جب وہ بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت کے لیے جاؤ۔ (۶) اور جب وہ مرجائے تو اس کی نماز جنازہ پڑھو اور جنازہ کے ساتھ جاؤ۔ (مسلم)

مریض کی عیادت و تسلّی اور اس کی خدمت و ہمدردی کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اونچے درجے کا نیک عمل اور ایک طرح کی مقبول ترین عبادت بتلایا ہے اور مختلف طریقوں سے اس کی ترغیب دلائی۔ خود آپؐ کا دستور بھی یہی تھا کہ آپؐ بیماروں کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے۔ اُن سے ایسی گفتگو فرماتے جن سے بیماروں کو تسلّی ہوتی اور اُن کا غم ہلکا ہو جاتا۔ قرآنی آیتوں کو پڑھ کر اُن پہ دم فرماتے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین فرماتے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر تھے کہ اتنے میں انصار کا ایک آدمی آیا اور اس نے حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا۔ پھر واپس جانے کے لیے مُڑا تو آپؐ نے اس شخص سے دریافت فرمایا: سعد بن عبادہ کیسے ہیں؟ وہ بیمار تھے۔ انصاری نے عرض کیا۔ پہلے سے کچھ افاقہ ہے۔ آپؐ نے تمام حاضرینِ مجلس سے ارشاد فرمایا: آپ لوگوں میں سے کون اُن کی عیادت کے لیے چلیں گے؟ آپؐ کے ساتھ ہی ہم سب بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہماری تعداد دس سے کچھ زائد تھی۔ ہم لوگ حضرت سعد کے گھر پہنچے تو اُن کے پاس سے بیٹھے ہوئے لوگ ہٹ گئے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھی حضرت سعد کے پاس گئے اور ان کی عیادت کی۔ (بخاری شریف)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس بندے نے کسی مریض کی عیادت کی تو اللہ تعالےٰ کا منادی آسمان سے پکارتا ہے کہ تو مبارک اور تیرا عیادت کے لیے چلنا مبارک، تو نے یہ عمل کر کے جنّت میں اپنا گھر بنا لیا ہے۔ (سننِ ابنِ ماجہ)

بیمار انسان چوں کہ جسمانی تکلیف اور ذہنی پریشانی کا شکار ہوتا ہے۔ اس لیے اس بات کا مستحق سمجھا گیا ہے۔ کہ اُس کے دکھ کو کم کرنے اور اُس کے دل کو تسلّی دینے کی حتی الامکان کوشش کی جائے۔ مریض کے سرہانے بیٹھ کر اس کے سر یا بدن پہ ہاتھ پھیرا جائے اور اُسے نصیحت کی جائے تاکہ اس کا ذہن آخرت کے اجر و ثواب کی طرف متوجّہ ہو جائے

اور بے صبری اور شکوہ شکایت کا کوئی کلمہ اس کی زبان پہ نہ آنے دیں۔

حضرت عائشہ بنتِ سعدؓ بیان کرتی ہیں : میرے والد نے اپنا قصّہ سنایا کہ میں ایک بار مکہ میں سخت بیمار ہو گیا۔ نبیؐ کریم صلے اللہ علیہ وسلم میری عیادت کے لیے تشریف لائے تو میں نے پوچھا : یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں کافی مال چھوڑ رہا ہوں وہ مسلمانوں کی بھلائی کے لیے وصیت کرنا چاہتا ہوں۔ آپؐ نے پوچھا : تمہاری کوئی اولاد ہے ؛ کہا : میری صرف ایک بچّی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کل مال کی وصیت سے منع فرمایا : میں نے پھر عرض کیا : میں اپنے مال میں سے آدھے مال کی وصیت کر جاؤں ! آپ نے ارشاد فرمایا : نہیں۔ میں نے پھر عرض کیا : یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پھر تو میں ایک تہائی کی وصیت کر جاؤں ؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا : ہاں ! ایک تہائی کی وصیت کر جاؤ ، ایک تہائی بہت ہے

اس کے بعد نبیؐ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک میری پیشانی پہ رکھا اور میرے چہرے پہ اور پیٹ پر پھیرا پھر دعا فرمائی : اے اللہ ! سعد کو شفاء کلی عطا فرما اور اس کی ہجرت کو مکمل فرما دے۔ اس کے بعد سے آج تک جب کبھی خیال آتا ہے تو نبیؐ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک کی ٹھنڈک اپنے جگر پہ محسوس کرتا ہوں۔ (الادب المفرد)

حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبیؐ کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب کسی مریض کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے تو اُس کے سرہانے تشریف رکھتے تھے اس کے بعد سات مرتبہ فرماتے : اَسْأَلُ اللّٰهَ الْعَظِيْمَ رَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ اَنْ يَّشْفِيَكَ : میں اللہ تبارک و تعالےٰ سے جو عرشِ عظیم کا رب ہے سوال کرتا ہوں کہ وہ تجھے شفاء بخشے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا : یہ دعا سات مرتبہ پڑھنے سے مریض ضرور شفاء یاب ہوگا۔ اِلّا یہ کہ اس کی موت کا وقت آ گیا ہو۔ (مشکوٰۃ شریف)

حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ کا فرمان ہے کہ نبیؐ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : جب کوئی شخص دن کے آخری حصے میں کسی مریض کی عیادت کرتا ہے تو اُس کے ساتھ ستر ہزار فرشتے نکلتے ہیں۔ جو صبح ہونے تک اُس کے لیے دعاء مغفرت کرتے ہیں۔ اور اُس کے لیے بہشت میں ایک باغ معین کیا جاتا ہے۔ (ابو داؤد)

حضرت انس اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمام مخلوق اللہ تعالےٰ کی عیال ہے۔ پس اُسے اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہے، جو اُس کے عیال کے ساتھ حسنِ سلوک کرے۔ (شعیب الایمان)

عیادت کے لیے جانے والے کو چاہیے کہ وہ بیمار کے لیے دل کو خوش کُن باتوں سے لبھانے اور خوش کرنے کی کوشش کرے۔

مثلاً مریض سے یہ کہا جائے کہ تمہاری حالت بہت بہتر ہے۔ انشاء اللہ تم بہت جلد صحت یاب ہو جاؤ گے۔ اس طرح کی باتیں کسی بھی ہونے والی چیز کو روک تو نہیں سکیں گی (جو ہونے والا ہے۔) لیکن اس طرح کی تسلّی سے اس کا دل ضرور خوش ہو جائے گا۔ (جامع ترمذی : سنن ابن ماجہ)

نبی صلّے اللہ علیہ وسلم نے کسی بھی بیماری یا مرض کو بُرا بھلا کہنے سے سختی سے منع فرمایا ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم اُمّ السائبؓ کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اُمّ السائبؓ بخار کی شدت سے کانپ رہی تھیں۔ آپؐ نے دریافت فرمایا۔ کہ کیا حال ہے؟ اُمّ السائبؓ نے بخار کو بُرا بھلا کہا۔

اُمّ السائبؓ کی یہ باتیں سُن کر سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بخار کو بُرا بھلا مت کہو۔ یہ مومن کے گناہوں کو اس طرح صاف کر دیتا ہے جیسے آگ کی بھٹی زنگ کو صاف کر دیتی ہے۔ (الادب المفرد)

نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو بلکہ غیر مسلموں کی عیادت کے لیے بھی تشریف لے جاتے تھے۔ اور صحابہ کرامؓ کو بھی اس کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ آپؐ مناسب موقعہ پاکر بڑی حکمت کے ساتھ اُس کو دینِ حق کی طرف متوجہ فرماتے۔ کیوں کہ یہ ایک فطری تقاضہ ہے کہ انسان دکھ، بیماری کی حالت میں اللہ کی طرف نسبتاً زیادہ متوجّہ ہوتا ہے اور قبولیت کا جذبہ بھی عموماً زیادہ بیدار ہوتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ ایک یہودی لڑکا نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتا تھا۔ ایک بار وہ بیمار پڑا تو آپ صلے اللہ علیہ وسلم اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور اس کے سرہانے بیٹھے تو اُسے اسلام کی دعوت دی۔ وہ یہودی لڑکا اپنے باپ کی طرف دیکھا جو پاس ہی موجود تھا۔ کہ باپ کا کیا خیال ہے۔ باپ نے بیٹے سے کہا: بیٹے! ابوالقاسم کی بات مان لے۔ چنانچہ لڑکا مسلمان ہو گیا۔ اور کلمہ شہادت پڑھ کر دینِ اسلام میں داخل ہو گیا۔ اب نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم اس کے یہاں سے یہ فرماتے ہوئے باہر تشریف لائے کہ شکر ہے اُس خدا کا جس نے اس لڑکے کو جہنم کی آگ سے بچالیا۔ (بخاری شریف)

اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ اُس بوڑھی عورت کا ہے۔ جو روزانہ آپؐ پر کوڑا کرکٹ پھینکا کرتی تھی۔ لیکن

آپؐ نے کبھی شکایت نہیں کی اور نہ ہی کبھی آپؐ نے اس بوڑھی عورت کو بد دعا دی۔ ایک دن صبح کے وقت جب آپ حسبِ معمول اُس بوڑھی عورت کے مکان سے گزرے، تو آپؐ پر اس بوڑھی عورت کوڑا نہیں پھینکا۔ آپؐ نے لوگوں سے اُس بوڑھی عورت کے بارے میں دریافت فرمایا۔ پڑوس کے لوگوں نے آپؐ کو بتایا کہ وہ بوڑھی عورت بیمار ہے، اُسے بخار ہے۔ آپؐ اُس بوڑھی عورت کی عیادت کے لیے اس کے پاس تشریف لے گئے۔ آپؐ کو دیکھ کر وہ عورت گھبرائی۔ لیکن آپؐ نے اس کی مزاج پرسی کے ساتھ ساتھ تیمارداری فرمائی، اس کے لیے دوا اور خوراک کا انتظام فرمایا۔ آپؐ کے اس حسنِ اخلاق سے وہ بوڑھی عورت اس قدر متاثر ہوی کہ فوراً ایمان لے آئی۔

ان واقعات سے پوری اُمّتِ مسلمہ کے لیے ایک سبق ہے۔ جس طرح ہم اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کرتے ہیں اسی طرح غیر مسلموں کی عیادت بھی کرنی چاہیے اور ایسے موقعوں پر خدمت اور تیمارداری کے ذریعہ اسلام کا آفاقی پیغام اُن تک پہنچانا چاہیے۔ شاید یہی کاوش آخرت میں ہماری نجات کا سبب بن جائے۔ عیادت کے لیے کچھ آداب بھی ہیں۔

حضرت عبداللہ ابنِ عبّاس رضوان اللہ عنہم سے روایت ہے کہ مریض کے پاس عیادت کے سلسلہ میں شور نہ کرنا اور کم بیٹھنا سنّت ہے۔ (مشکوٰۃ شریف)

یہ ہدایت عام بیماروں کے لیے ہے۔ لیکن اگر کسی دوست بیمار پڑ جائے اور اُسے یہ اندازہ ہو کہ وہ اُس کے بیٹھنے کو پسند کرتا ہے، تب وہ بیٹھا رہ سکتا ہے۔ مریض کے دیگر اہلِ خانہ سے بھی مریض کا حال پوچھنا چاہیے اور اظہارِ ہمدردی کے ساتھ ساتھ جو بھی خدمت اور تعاون ہو سکے ضرور کرنا چاہیے۔ مریض کے گھر کی تاک نے جھانکنے سے پرہیز کرنا چاہیے اور اس انداز سے بیٹھنا چاہیے کہ گھر کی خواتین پر نگاہ نہ پڑے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہٗ ایک بار کسی مریض کی عیادت کے لیے گئے۔ ان کے ہمراہ کچھ اور لوگ بھی تھے ان میں ایک خاتون بھی تھیں۔ حضرت کے ساتھیوں میں سے ایک صاحب اس خاتون کو گھورنے لگے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو جب محسوس ہوا تو فرمایا: اگر تم اپنی آنکھیں پھوڑ لیتے تو تمہارے حق میں بہت بہتر تھا۔

ابنِ ماجہ میں ہے کہ جب تم کسی مریض کی عیادت کے لیے جاؤ تو اُس مریض سے اپنے لیے بھی دُعا کی درخواست کرو کیونکہ مریض کی دُعا ایسی ہے جیسے فرشتوں کی دُعا ہوتی ہے۔ یعنی فرشتے اللہ تعالیٰ کی مرضی پا کر ہی دُعا کرتے ہیں اور ان کی دُعا مقبول ہوتی ہے۔

اللہ ربّ العزت سے دُعا ہے کہ ہمیں اس پر عمل کرنے کی نیک توفیق عطا فرمائے ـــ آمین! ●●●

مسلم سائنسدان اور ان کے عظیم الشان کارنامے

محمد یوسف شمّاس آدھونی۔ اسٹیشن سوپرنٹنڈنٹ۔ قاضی پور، آدھونی

حضور اکرمؐ کی بعثتِ اقدس کے بعد مسلمانوں کا دورِ عظیم شروع ہوا۔ خلفائے راشدین کے بعد خلفائے بنو امیہ اور بنو عباس کا دور آیا۔ عرب کے علاوہ مصر، ایران، شام اسلامی سلطنت میں شامل ہوئے۔ اس کے بعد اس کا دائرہ افریقہ، یورپ اور ایشیا، کے سینے سے لے کر جزائرِ شرق الہند اور اندلس تک پھیلا۔ تقریباً بارہ سو سال سے زائد مسلمانوں نے بڑے طمطراق سے حکومت کی۔ جہاں مسلمانوں نے حکومت کی وہیں پر ہر قسم کے علم وفن کی جہانبانی کی۔

حضور اکرمؐ جب معراج تشریف لے جاتے ہیں۔ بارگاہِ ربّ العزت سے نمازوں کے تحفہ کے علاوہ رموز اسرارِ معرفت کا خزانہ بھی اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ یہی علم وعرفان کا سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حاصل ہوتا ہے۔ سرکارِ دوعالمؐ کا فرمانِ مبارک ہے: "انا مدینۃ العلم وعلی بابھا" میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں۔ یہی اسرار ومعرفت کا خزینہ سینہ بہ سینہ حضرات حسنین اور سیدنا امام جعفر صادقؓ کو حاصل ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سیدنا امام جعفر صادقؓ کے شاگرد رشید جابر بن حیّان تھے اور دنیائے سائنس نے انھیں علم کیمیا اور سائنس کا باوا آدم تسلیم کر لیا ہے۔

ابتداء ہی سے مسلمانوں نے سائنس کے ہر شعبہ میں نمایاں ترقی کی۔ یونانی علوم کو رواج دیا۔ اس دور میں فارسی، سنسکرت، سُریانی، مصری، یونانی وغیرہ مشہور زبانوں کے ذخائر اور قیمتی اور نایاب نسخوں کو تلاش کر کے ان کے تراجم عربی زبان میں کروائے۔ دُنیا کے چپہ چپہ کے ماہرین کی خدمات حاصل کی گئیں۔ سلطنت اسلامیہ کے خصوصی طور پر دو مراکز مشرق میں بغداد اور مغرب میں اندلس یعنی موجودہ اسپین تھے۔ بغداد میں "بیت الحکمت" یعنی دورِ قدیم کا اولین

رسیرچ سینٹر قائم کیا گیا۔ علمِ کیمیا، طب، ریاضی، ہندسہ، ہئیت، طبیعات، نباتات، حیوانات، نجوم، جغرافیہ، الجبرا
فلکیات وغیرہ کو بے حد ترقی دی اور کئی علوم ایجاد کئے۔ جس وقت اسپین میں مسلمان حکمرانی کر رہے تھے اس وقت سارا
یورپ تاریکی اور جہالت کے دلدل میں پھنسا ہوا تھا۔ آج ہم دَورِ جدید کے یورپ اور مغربی دُنیا کی جو ترقی دیکھ رہے ہیں
یہی تو مسلم حکمرانوں، سائینسدانوں، فلسفیوں کی مرہونِ منت ہیں۔

مسلمانوں نے سب سے پہلے بارود اور بندوق ایجاد کی۔ راکٹ سازی اور ہوائی جہاز بنانے کی ابتدا کی ۴۹ھ
میں امیر معاویہؓ کے دَور میں ایک عرب انجنیئر نے ہوائی جہاز ایجاد کیا جو دمشق سے قسطنطنیہ (استنبول) جا رہا تھا۔ جو راستہ میں
گر کر تباہ ہوا۔ اور انجنیئر اسی میں فوت ہوا۔ عربوں نے آبی اور شمسی گھڑیوں کی ایجاد کی۔ پنڈولم کی گھڑی بھی عربوں ہی کی ایجاد ہے
پن چکیوں کو ایجاد کیا۔ اور ہوائی چکیوں کو فروغ دیا۔ جہاز سازی کو ایسی ترقی دی کہ ایک ہزار ٹن سے زائد وزنی جہاز بنائے
دمشق، قاہرہ، تیونس میں جہازوں کے بڑے بڑے کارخانے تھے۔ کاغذ سازی کو ترقی دی، جب کہ اس سے پہلے چمڑے پر لکھنے کا
رواج تھا۔ شمسی کیلنڈر ایجاد کیا۔ قطب نما اور کمپاس ایجاد کیا۔ الجبرا کے بانی مسلمان ہیں۔ ہندسہ کو ترقی دی۔ معدنیات
کی درجہ بندی کی۔ خشکی اور سمندر کی پیمائش کی۔ سطحِ زمین کی پیمائش کا مشکل کام انجام دیا۔ زمین سے چاند کے فاصلہ کا اندازہ
لگایا۔ ستاروں اور سیّاروں کی حرکات کو معلوم کیا۔ فنِ تعمیر اور انجنیئرنگ میں حیرت انگیز کارنامے انجام دیے۔ تیزاب،
ترشے اور دیگر کیمیا کو ایجاد کیا۔ زراعت اور کاشت کاری کو فروغ دیا۔ ریشم اور اس کے پٹوں کی کاشتکاری کی۔ دَورِ قدیم
سے عربوں میں سونا بنانے کا رواج رہا ہے مگر بجائے اس کے حیرت انگیز اشیاء کا وجود عمل میں آیا۔ اس مضمون میں چند
مشاہیر حکماء، سائینس دانوں کا مختصر سا تذکرہ کر رہے ہیں:

ابوبکر محمّد زکریا رازی پیدائش ۲۵۱ھ ایران کے شہر رے میں۔ مشہور کیمیادان، ماہرِ طب
فلسفی، منطق، طبیعات وغیرہ کا استاد۔ کم و بیش دو سو کتابوں کا مصنف۔ علمِ کیمیا میں اس نے معدنیات کی تعداد نو سو سے
زاید بتائی۔ طب پر اس کی مشہور تصنیف "الحاوی" جسے ماضی میں "طب کی انجیل" کہا جاتا تھا۔ الحاوی کی بیس جلدیں تھیں۔
جو دُنیا کی مختلف کتب خانوں اور خصوصاً یورپ کی لائبریریوں کی زینت بنی ہیں۔ دائرۃ المعارف حیدر آباد سے بھی سترہ ۱۷
جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ معدنیات پر اس کی مشہور کتاب "اخوان الصفا" ہے۔ وصال ۳۱۳ھ میں ہوا۔

ابوریحان البیرونی نام برہان الحق محمد بن احمد البیرونی تھا، الخوارزم کے شاہی خاندان سے
وابستہ رہا اور اس کے بعد سلطان محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آیا۔ علمِ نجوم و فلکیات، جغرافیہ، معدنیات

طبقات الارض، طب، ادویات اور آثار قدیمہ کا ماہر تھا۔ ۱۸۱ کتابوں کا مصنف، ادویات پر اس کی کتاب "الجماہر فی معرفۃ الاخواص الادویہ، طب میں" قانونِ مسعودی"۔ تاریخ و جغرافیہ میں عجائب الہند مشہور ہیں۔ اس نے بتایا کہ وادیٔ سندھ کے ریتیلے میدان کبھی سمندر کا حصہ تھے۔ ۷۷ سال کی عمر میں ۴۴۵ھ، غزنی میں وفات پائی۔

ابنِ ہیثم پیدائش بصرہ، پھر مصر منتقل ہوا۔ ماہر بصریات۔ طبیعات میں روشنی کا انعکاس اور انعطاف اسی نے دریافت کیا۔ یہی نظریات یورپ میں سائینسی طبیعات کے لیے پیش رو ثابت ہوئے، جو طبیعات کا اہم جزو ہیں۔ مشہور فلسفی اور ماہر طب تقریباً دو سو کتابوں اور رسائل کا مصنف ہے۔ بصریات میں اس کی مشہور کتاب "المناظر" ہے۔ ہئیت میں اسے بطلیموسِ ثانی کہا جاتا ہے۔ ۴۳۰ھ میں ۶۳ سال کی عمر میں وفات پائی۔

الزرقالی اسپین کا ماہر فلکیات۔ سیاروں کی حرکت کا اسی نے مشاہدہ کیا کیپلر اور کوپرنکس سے پہلے زمین کا آفتاب کے گرد گھومنا اسی نے دریافت کیا۔ آلات ہئیت پر اس کی مشہور کتاب " العبادیہ" ہے۔

ابوالحسن اس نے دوربین ایجاد کی۔ جس سے دور دراز کے ستاروں کا مشاہدہ کیا جا سکے۔

ابن خردازبہ اسے مسلم جغرافیہ کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ ہندوستان، سری لنکا اور جزائر شرق الہند کا نقشہ تیار کیا تھا۔

ادریسی بارھویں صدی عیسوی کا مشہور جغرافیہ دان۔ جس نے زمین کو سات موسمی خطوں میں تقسیم کیا۔ سسلی کے بادشاہ کے لیے ایک شاہ کار عالمی نقشہ تیار کیا۔ دریائے نیل اور دوسری مشہور ندیوں کے منبع دریافت کیا۔ جسے موجودہ دور کے جغرافیہ دانوں نے ترقی دی۔

اسماعیل بن حماد جس نے ہوائی جہاز بنانے کی ابتداء کی۔

ابن رشد ابوالید ابن رشد۔ پیدائش ۵۲۰ھ، قرطبہ۔ ماہر طب، ہئیت دان، نجوم، فلکیات اور مشہور فلسفی جس کے فلسفے سے یورپ میں انقلاب عظیم آیا۔ سیارہ عطارد کی رفتار معلوم کی۔ طب میں ارسطو، جالینوس، حکیم بوعلی سینا پہ شرحیں تحریر کی۔ ۵۹۵ھ میں مراکش میں رحلت پائی۔

ابراہیم بن سیار المعروف نظام جس نے سب سے پہلے نظریۂ ارتقاء پیش کیا جسے دورِ جدید کے سائینسدانوں نے ترقی دی۔

ابو عیسیٰ محمد بن حسن البصری مشہور ماہر ہیئت اور ریاضی دان۔ اسی کے طفیل کپلر کو کرہ ہوائی کا علم ہوا۔

ابوالوفا ماہر ہیئت۔ اعلےٰ درجے کے آلات کا موجد۔ زمین، چاند، ستاروں سیاروں کی گردش کے بارے میں حیرت انگیز دریافتیں کی۔ عباسی خلیفہ متوکل کے دور میں ایک رصدگاہ تعمیر کی۔

حکیم بوعلی سینا علم طب کا استاد، جس کے بغیر طب کی تاریخ نامکمل ہے۔ پیدائش ۳۷۵ھ بخارا میں ہوی۔ مختلف فنون پر سینکڑوں کتابیں تحریر کیں۔ طب کی مشہور کتاب "القانون" اور اس کے ترجمے اٹھارہویں صدی تک یورپ کے میڈیکل کالجوں کی زینت بنی رہی۔ طبیعات، کیمیا، معدنیات، حیوانات، ارضیات وغیرہ کا ماہر تھا۔ مختلف مسائل پر کئی رسائل تحریر کیا۔ ۴۲۸ھ میں انتقال کیا۔

صوفی جابر بن حیّان دنیا نے سب سے پہلے عرب کا سائنس دان تسلیم کیا ہے۔ انھیں علم کیمیا کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ طبیعات، علم الادویہ، نباتات کے ماہر، جنھوں نے جڑی بوٹیوں کی افادیت پر روشنی ڈالی تیزاب شورے، ترشے، مادے تیزاب اور کئی عناصر تیار کئے۔ کئی رسائل کے مصنف وصال ۱۹۸ھ یا ۲۰۰ھ میں ۸۰ سال کی عمر میں ہوا۔

داؤد انطاکی انطاکیہ قصبہ قوعہ میں ۹۵۰ھ میں ولادت ہوی۔ پیدائشی نابینا تھا۔ اناطولیا اور دمشق سے ہوتے ہوے مصر آیا اور وہیں کی بودوباش اختیار کی۔ دنیا کا عظیم الشان ماہر طب اور کئی کتابوں کا مصنف۔ طب پر اس کی مشہور کتاب "تذکرۂ اولی الباب" شائع ہو کر شہرت حاصل کی۔

سلیمان تاجر مارکوپولو سے پہلے اس نے ہند، مشرق بعید اور چین کا سفر کیا جس کا تذکرہ "اخبار الصین والہند" میں ملتا ہے۔ کتاب "سلسلۃ التواریخ" میں ہندوستان کے ساحلی علاقوں پر تفصیلی معلومات ملتے ہیں۔

ضیاء الدین ابن بیطار مشہور ماہر نباتات تھا۔ یورپ کے جنگلوں اور اس کی جڑی بوٹیوں پر کئی کتابیں تحریر کیں۔ وصال ۶۴۶ھ میں ہوا۔

عمر خیّام عمر خیام کو دنیا فارسی شاعری میں خمریات اور اس کی رُباعیات سے پہچانتی ہے۔ مگر وہ ماہر نجوم و فلکیات بھی تھا۔ اس نے شمسی کیلنڈر بھی ایجاد کیا۔ جو آج کے گریگورین کیلنڈر سے بہتر تھا۔ ریاضی،

اور الجبرا، تصوّف وغیرہ پر کئی رسائل تحریر کئے ۔ ۵۲۶ھ میں نیشاپور میں رحلت کی ۔

عبدالرزاق الخوارزمی ماہر ریاضی اور الجبرا کا موجد تھا ۔ جغرافیہ میں زمین کا نقشہ ماہرین کیساتھ تیار کیا تھا۔

عطارد بن محمد الکاتب معدنیات پر کئی سال تجربات کئے ۔ اس موضوع پر اس کی مشہور کتاب "الجواہر والمجار" ہے۔

عباس بن فرناس اسپین کا مشہور سائنسدان جس نے اڑتی مشین اور عینک ایجاد کی۔ اپنے گھر میں ایک مصنوعی سیارہ گاہ تعمیر کیا تھا۔

ابونصر فارابی ۸۷۵ھ شہر فاراب کے ترک خاندان میں پیدا ہوا۔ عربی، فارسی، یونانی اور کئی زبانوں کا ماہر تھا۔ مختلف موضوعات پر سو سے زاید کتابیں لکھیں۔ طب، ریاضی، جیومیٹری، نباتات، معدنیات، موسیقی کا ماہر تھا۔ اسی نے طبیعیات کو فزیکا کا نام دیا۔ مختلف ممالک کی سیر کی۔ اپنی خداداد صلاحیت کی بنا پر "ارسطو ثانی" کہا جانے لگا۔ ۹۵۰ھ میں دمشق میں رحلت پائی ۔

معمر بن مثنیٰ ماہر حیوانات ۔ اس موضوع پر سو سے زاید کتابیں تحریر کی ہیں۔

فرغانی ماہر فلکیات ۔ ۸۶۰ھ میں ماوراء النہر میں پیدا ہوا۔ سات سو سال تک دنیا کے گوشہ گوشہ پر اس کے موضوعات زیر بحث رہے ۔

مسعودی مشہور جغرافیہ دان اور مورخ ۔ بحر مردار کے زلزلوں، طوفانوں، سمندری لہروں اور اس کے موتیوں وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔

یعقوب بن اسحاق کندی ابو یوسف یعقوب بن اسحاق کندی نویں صدی عیسوی میں سرزمینِ عرب کا دانشور، فلسفی، ہیئت دان، ماہر طب، ریاضی، ہندسہ، کیمیا، الجبرا، نجوم و فلکیات، معدنیات وغیرہ کا ماہر۔ کئی موضوعات پر ۲۲۶ کتابیں تحریر کیں۔ اب تک دنیا کے بارہ چوٹی کے دانشوروں میں کندی کا نام بھی ہے اور دنیا کے آٹھ بڑے ماہرِ فلکیات میں کندی کا نام سب سے پہلے لیا جا رہا ہے۔

حوالہ جات: تاریخ طب و اطباء قدیم ۔ اسلامی طب ۔ عمر خیام ۔ تاریخ ابن خلکان ۔ عربوں کی جہاز رانی ۔ اسلامی اور عربی تمدن ۔ قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کے سائنسی کارنامے ۔ رسائلِ ابنِ ہیثم ۔ رسائل البیرونی ۔ کتاب الحادی وغیرہ۔

محمد بشير اللطيفي بن محمد واكد پرمب كيرلا
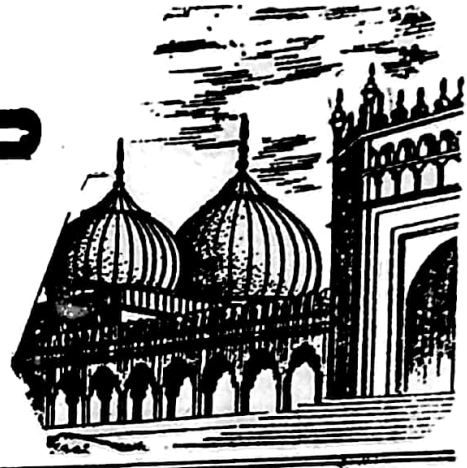
نحن نعيش فى الارض التى خلق الله سبحانه وتعالى الارض للانسان وما فيها ليكسبوا فيها وليعيشوا فيها عيشة راضية إنّا اذا نظرنا الى الارض فنبصر الحيوان والجمادات كل يذكر الله واختار الله ۔ من الحيوان والجمادات الانسان والجن ليعبد والله سبحانه وتعالى ۔ كما قال الله تعالى فى قرأنه المجيد وما خلقت الجنّ والانس الا ليعبدون ۔ وقد دلت الاية ان الجنّ والانسان خلقوا للعبادة لأن الله سبحانه وتعالى اراد ان يخلق الانسان فقال للملائكة انى جاعل فى الارض خليفة الذى تعبدونى قالوا اتجعل فيها من يفسد فيها ويسفك الدماء ونحن نسبح بحمدك ونقدس لك ۔ قال انى اعلم ما لا تعلمون ۔ وقد فسر عمر النسفى فى تفسير النسفى فى تفسير هذه الآية انها الانبياء والعلماء والاولياء وقد دل قول الملائكة لسبحانه وتعالى انّ الانسان يظلم ويقاتل ويفسد فى الارض فلا تخلق الانسان لم خلقت الانسان ؟ انا نعبدك ونقدّس لك فى كل وقت فاجاب الله سبحانه وتعالى بانى اعلم ما لا تعلمون واراد الله با علم الانبياء والعلماء والاولياء وهم من ذرّية آدم واعطى الله للانسان درجة وفضيلة من الملائكة ۔ كما نطق القرآن بها وعلّم آدم الاسماء الخ وانعم علينا من كون امة محمد صلى الله عليه وسلّم ولقد علمنا من الآيات التى من قبل انّ للانسان درجة من الملائكة فالانسان انواع من هدايات والارشادات على حسب قوله تعالى والذى قدر فهدى كل ذالك ليرتقى الانسان بالترقى الى اوج الكمال على حسب مقتضته تبيعته واستعداته

الکامنۃ ویستقرون فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر وذلک الفوز المبین اولائک لاخوف علیھم ولاھم یحزنون۔ وقد علمنا من ماذکرنا ان الاولیاء الذین عرفوا اسرار النشأۃ الدنیویۃ و الاخرویۃ فصاروا من الموقنین حتی الولی الولی ھو العارف باللہ تعالی وصفاتہ بحسب ما یمکن المواظب علی الطاعات المجتنب عن المعاصی المعرض عن الانھماک فی اللذات والشھوات فتظھر الکرامۃ من الولی ھی امر خارق للعادۃ قصد بہ اظھار صدق من ادعی انہ رسول اللہ علیہ افضل الصلواۃ والسلام وکانت الکرامۃ کثیرا من الاولیاء وقد ثبتت الکرامۃ بالقرآن والحدیث والاجماع الکرامۃ تتنوع باختلاف الاشخاص وکانت الکرامۃ من قبل زماننا ھذا فیظھر الکرامۃ علی طریق نقض العادۃ للولی من قطع المسافۃ البعیدۃ فی المدۃ القلیلۃ کاتیان صاحب سلیمان علیہ الصلوۃ والسلام وھو آصف بن برخیا علی الاشھر بعرش بلقیس کانت تملک الیمن قبل ارتداد الطرف مع بعد المسافۃ وھی مسیرۃ شھرین وظھور الطعام والشراب واللباس عند الحاجۃ کما نطق القرآن ھذین القصتین فی سورتی آل عمران والنمل۔ قال الذی عندہ علم من الکتاب انا آتیک بہ قبل ان یرتد الیک طرفک الخ کلما دخل علیھا زکریا المحراب وجد عندھا رزقا قال یامریم انی لک ھذا قالت ھو من عند اللہ والمشی علی الماء کما نقل عن کثیر من الاولیاء والطیران فی الھواء کما نقل عن جعفر بن ابی طالب وعن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالی عنہ قال قال رسول اللہ علیہ افضل الصلوۃ والسلام رأیت جعفرا یطیر فی الجنۃ مع الملائکۃ۔ رواہ الترمذی۔

فروی انہ کان للشیخ احمد بن خضرویہ الف مرید یمشون علی الماء ویطیرون علی الھواء وکلام الجماد والعجماء اما کلام الجماد فکما روی انہ کان بین سلمان وابی الدرداء رضی اللہ عنھما قصعۃ فسبحت وسمعا تسبیحھا رواہ البیھقی وابونعیم کلاھما فی دلائل النبوۃ واما کلام العجماء فتکلم الکلب لاصحاب الکھف وھم سبعۃ رجال من المومنین ھربوا من دقیانوس الملک حین دعاھم الی الشرک فا تبعھم کلب فطردوہ فتکلم وقال لا تطردونی فانی احب اولیاء اللہ سبحانہ وتعالی وکرامات الاولیاء کثیرۃ منھا ما روی ان عمر رضی اللہ عنہ بعث جیشا وامر علیھم ساریۃ بن زنیم فبینا ھو یخطب علی المنبر یوم الجمعۃ بمدینۃ اذ ترک الخطبۃ وقال یا ساریۃ الجبل ثلاث

مرأته فالتفت الحاضرون بعضهم الى بعض حتى قال بعضهم انه مجنون - فقال على رضى الله عنه ليظهرن ماقال ثم سأله عبد الرحمن بن عوف وكان يستأنس به فقال رأيت المشركين هزموا اخواننا ويأتونهم من بين ايديهم وظهورهم فامرتهم ان يسندوا ظهورهم الى الجبل حتى يقاتلوا من وجه واحد فجاء بشير بعد شهر وقال حاربنا العدو وقت الصلوة الجمعة فهزمونا فسمعنا مناديا ينادى يا سارية الجبل فلحقنا بالجبل فانهزم العدو رواه البيهقى ومن كرامة الاولياء شرب خالد رضى الله عنه السم من غير التضرر به ومن كرامة الغريبة ماروى انه لما فتح عمرو بن العاص الصحابى مصر فى عهد عمر بن الخطاب رضى الله عنه قال له اهلها ان النيل لايجرى الا بان يلقى فيه جارية بكرمع افضل مايكون من الحلى والثياب اذامضى احدى عشرة ليلة من هذا الشهر فقال عمرو رضى الله عنه هذا لايكون فى الاسلام فجف النيل حتى اراد الناس الجلاء فكتب الى عمر فاستحسن عمر رضى الله عنه نهيه عن القاء الجارية وبعث بهذا الكتاب ليلقى فى النيل من عبد الله عمر امير المومنين الى نيل مصر امّا بعد فان كنت تجرى من قبلك فلا تجرى وان كان الله تعالى بجريك فاسأل الله الواحد القهار ان يجريك فجرى من وقته الي يومنا رواه ابو الشيخ وكرامات الاولياء كثيرة من ان يحصى انى اوردمنها نبذة هنا وانكرا لمبتدعون الكرامة وقالوا ومن يؤمن ان الكرامة حق كان كافرا فيعلم مما ذكرنا ان الكرامة حق بالكتاب والسنة ومن تأمل ماذكرنا يعلمون أن الكرامة حق والله يهدى من يشاء ويضل من يشاء وفى زماننا هذا كثير من الاولياء ليس لهم علم يلبسون الثياب الابيض ورداء الخضراء وقالوا انّا نحن اولياء الله تعالى فليسوا اولياء الله تعالى بل اولائك هم المضلون يضلون الناس اللّٰهم انا نعوذبك عنهم اللّٰهم احينا تحت تربية الاساتيذ و العلماء والصالحين - آمين ۔ وما علينا الا البلاغ

اسلوب المواعظ والحکم فی شعر ابی العتاهیة

حافظ محمد فرید الدین سرقاضی۔ (کامل الفقہ جامعہ نظامیہ ایم اے، ایم فل (عثمانیہ)

من المعلوم ان الموضوع الرئیسی لهذه المقالة الوجیزة یدور حول المواعظ والحکم والامثلة فی شعر ابی العتاهیة، فاذا لاحظنا الزهدیات فی الزهدیات شعر ابی العتاهیة وجدناها مستفادة ومأخوذة من القرآن الکریم والاحادیث النبویة علی صاحبها افضل الصلوات والتسلیم، واقوال الصحابة والتابعین، ففی بعض الاحیان اقتبس من الآیات والاحادیث مباشرا، وفعلی سبیل المثال نقدم الابیات العدیدة مقتبسة الفاظها ومفهومها من القرآن الکریم والحدیث النبویة: فیقول:

تموت فردا وتأتی ! یوم القیامة فردا [1]

هذا البیت مستفاد من الآیات من سورة مریم "وکلهم آتیه یوم القیامة فردا (۹۵)

وکذلك ذکر الشاعر یوم القیامة مستفیدا من سورة التغابن "یوم یجمعکم لیوم الجمع ذلك یوم التغابن. (۹) فی البیت التالی ۔

وهو یقول :

أ اخی مالك ناسیا یوم التغابن فی الامور [2]

وذکر العدل والانصاف بعباده یوم القیامة یقول ابو العتاهیه :

غدا توفی النفوس ما کسبت ویحصد الزارعون ما زرعوا [3]

---

[1]، [2]، [3] : دیوان ابی العتاهیة : ص: ۸۲، ۹۸، ۱۶

فجمع ابو العتاھیۃ، تعالیم القرآن والحدیث فی بیت واحد مذکورہ اعلاہ، الشطر الاول مستفاد من قولہ تعالیٰ "ووفیت کل نفس ما کسبت وھم لا یظلمون"[1]: ۲۵: واما الشطر الثانی من مفہوم الحدیث الشریف "کما تزرع تحصد"۔

قال شاعرنا: مثنیا علی اللہ عزوجل مستفیدا من الآیات القرآن الحکیم: حسبنا اللہ ونعم الوکیل: ۱۸۳ ـ وإن تولوا فاعلموا أن اللہ مولاکم نعم المولیٰ ونعم النصیر[2]: ۴۰

فیقول:

حسبنا اللہ ربنا ھو مولی خیر مولی ونحن شر عبید[3]

انظر الی ھذا البیت کیف استخدم الآیۃ باسلوب جمیل خلاب، قل یوجد نظیرہ عند الشعراء الآخرین، یتضح بالتمسک بالعروۃ الوثقیٰ:

یقول شاعرنا:

ولا تجعلن الحمد الا لأھلہ ولا تدع الامسک بالعروۃ الوثقی[4]

فھذا البیت المذکور بالآیۃ "فقد استمسک بالعروۃ الوثقی"[5] وھناک فی البیت التالی یظھر شاعرنا آمرا للمعروف ومبلغا احکام اللہ عزوجل الی عامۃ الناس، فیقول:

اقم الصلاۃ لوقتھا بطھورھا ومن الضلال تفاوت المیقات[6]

الشطر الاول مفھومہ مأخوذ من سورۃ الإسراء: "اقم الصلوۃ لدلوک الشمس الی غسق اللیل وقرآن الفجر إن القرآن الفجر کان مشھودا[7]: ۷۸

---

[1] سورہ آل عمران ۲۵

[2] الموضوع الاول آل عمران: آیۃ: ۱۷۳: الموضوع الثانی سورۃ الانفعال: آیۃ: ۴۰

[3،4] دیوان ابی العتاھیۃ: ص: ۸۵، ۱۷۰

[5] سورۃ البقرۃ: آیۃ: ۲۵۶

[6] دیوان ابی العتاھیۃ: ص: ۴۳

[7] سورۃ الاسراء: آیۃ: ۷۸

وفیہ الحث علی اقامة الصلوٰة بوقتہا فحامد اللہ تعالیٰ ومظہر ابقاء[1] ۔ وھلاک ماسواہ یوم القیامة

یقول شاعرنا:

فالحمد للہ الذی　　یبقی ویھلک ماسواہ[2]

فالبیت المذکور جاء مفہومہ فی سورة الرحمٰن فی قولہ تعالیٰ "کل من علیہا فان: ۲۶ ویبقی وجہ ربک ذو الجلال والإکرام: ۲۷۔

یشیر الی الایمان بالقدر والقضاء وقدرتہ، یقول شاعرنا:

إن قدر اللہ أمرا کان مفعولا　　وکیف نجھل أمرا لیس مجھولا[3]

وھذا البیت جاء مطابقا لھذہ الآیایة "وکان امر اللہ مفعولا"[4] ۳۷

محرضا علی الانفاق فی سبیل اللہ عزوجل، قال شاعرنا:

انفق فان اللہ یخلفہ　　لا تمض مذموما وتترکہ[5]

والبیت المذکور مستفاد من الآیة: وما انفقتم من شیٔ فھو یخلفہ وھو خیر الرازقین[6]: ۳۹ ۔ ویتضح من الابیات المذکورة اعلاہ ان الشاعر تأثر کثیرا بالقرآن الکریم واستفاد منہ استفادا کاملا لغرض التبلیغ والتنبیہ الغافلین ۔ وکذلک تأثر شاعرنا تأثرا عظیما بالاحادیث النبویة علی صاحبہا الصلوٰة والسلام ۔ واستخدمہا فی ابیاتہ مباشرا أو غیر مباشر ۔ فالابیات التالیة تدل علی عمق دراسة الحدیث الشاعر ناکذلک تبین حد تأثرہ بالحدیث الشریف، ومعظم ابیاتہ تضمن الاحادیث الشریفة حول موضوعات کالظلم، والترغیب فی القناعة، والتحریض علی ادخار الصالحات لیوم القیامة، اھمیة حسن المعاملة، تنبیہ الغافلین، ذکر زوال الدنیا ومافیھا وما الی ذالک من الموضوعات والیکم بعض الابیات المستفادة من الاحادیث النبویة علی صاحبہا الصلوٰة والتسلیم یشیر ابو العناھیة الی الظلم ودعوة المظلوم قائلا:

---

[1] دیوان ابی العتاھیة: ص: ۲۰۳　[2] سورة الاحزاب: ۳۷

[3] دیوان ابی العتاھیة: ص: ۱۹۲　[4] سورة السباء: ۳۹

[5] المصدر السابق: ص: ۲۵

يخشى عبد دعوة المظلوم وحكمة الحي بها القيوم[1]

في الحقيقة هذا البيت مستفاد من الاية : لايحب الله الجهر بالسوء من القول الامن ظلم[2] : ٢ ايضا جاء شرحا وافيا للحديث الشريف رواه البخاري ومسلم قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : اتق دعوة المظلوم فانه ليس بينها وبين الله حجاب" فيحذرنا هذا البيت من دعوة المظلوم لانها تصل الى الله دون تأخير، وكذلك جاء البيت التالي شرحا للحديث "الدين معاملة" فيقول الشاعر تحت موضوع "حسن المعاملة"

عامل الناس برأى رفيق وألق من تلقى بوجه طليق

فاذا أنت جميل الثناء وإذا أنت كثير الصديق[3]

فالشطر الاول من البيت الأول شرح للحديث الشريف رواه المسلم عن النبي صلى الله عليه وسلم قال " لاتحقرن من المعروف شيئا ولو أن تلقى أخاك بوجه طليق" فحسن المعاملة اساس لنشاة المودة والمحبة بين الفريقين فاذا عامل الانسان معاملة الرفق واللين مع الآخرين، فهو ايضا يعامل مثله، وجاء في قوله تعالى عزوجل مخاطب النبي صلى الله عليه وسلم " ولوكنت فظا غليظ القلب لانفضوا من حولك[4]" وفي هذه الآية اشارة ان الاخلاق الحسنة ترغيب الناس الى اهله -

هناك حديث مشهور عن ابن ماجة انه يقول، قال رسول الله صلى الله عليه وسلم "لوكانت الدنيا تعدل عند الله جناح بعوضة ما سقى كافرا منها شربة ماء"

فجاء نفس المفهوم للحديث في البيتين لشاعرنا ابي العتاهية:

ولا تعدل الدنيا جناح بعوضة لدى الله أو مقدار رغبة طائر

فلم يرض بالدنيا ثواب لمؤمن ولم يرض بالدنيا عقابا لكافر[5]

---

[1] المصدر السابق : ص : ٢٥٠
[2] سورة النساء: ١٤٨
[3] ديوان ابي العتاهية: ص: ١٧١
[4] سورة آل عمران : ١٥٩
[5] ديوان ابي العتاهية : ص : ١٠٢

هاتان البيتان تدلان على حقارة الدنيا وما فيها وليس عند الله أيّ قدر لها، وهي يعني الدنيا الجناح بعوضة او اقل منها قدرا۔

كما بينا اعلاه ان شاعرنا استفاد من اقوال الحكماء ايضا فمنهم قول لقمان لإبنه حينما ينصحه: يا بنى لاينبغى لعاقل ان يخلى نفسه من اربعة أوقات

فوقت منها يناجى فيه ربه، ووقت يحاسب فيه نفسه، ووقت يكسب فيه لمعاشه ووقت يخلى فيه بين نفسه وبين لذاتها ليستعين بذالك على سائر الأوقات

ألبس شاعرنا قالب الشعر لنصائح لقمان لابنه فى هاتين البيتين۔

ياعجبا للناس لو فكروا	اوحاسبوا أنفسهم أبصروا
وعبروا الدنيا الى غيرها	فإنما الدنيا لهم معبر[1]

فالبيت الاول مستفاد من قول لقمان الحكيم والبيت الثانى مأخوذ من قول الحسن وهو: أجعل الدنيا كالقنطرة تجوز عليها ولا تعمرها۔

وكذلك قال سيدنا علىؓ ابن أبي طالب: لاخير فى لذة زائلة واثمها دائم و يقول ابو العتاهية فى قالب الشعر:

فلرب شهوة ساعة	قد اورثت حزنا طويلا[2]

فاذا لاحظنا ابيات ابى العتاهية المذكورة اعلاه وجدنا انها مستفادة من القرآن الكريم والاحاديث الشريف واقوال الحكماء

امتثالا لامر الله تعالى عز وجل: "ادع إلى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتى هى احسن[3]" احيانا يظهر شاعرنا بشيرا واحيانا نذيرا واحيانا يأتى بالترغيب واحيانا بالترهيب كذلك ويخاطب شاعرنا الناس على قدر عقولهم فأحيانا يخاطب الملوك حسب مراتبهم واحيانا يخاطب اصحاب الفطرة السليمه واحيانا يخاطب أوسطهم

ص۱ ديوان ابى العتاهية: ص: ١٠٢ ص۲ ديوان ابى العتاهية: ص: ٢١٨

ص۳ سورة النحل: آية: ١٢٥

والآن نقدم اليكم المواعظ والحكم تحت الموضوعات التالية ـ

التقوىٰ، القناعة، الزهد، الامساك عن الشهوات، الانصاف والحلم، غرور الدنيا، زوال الدنيا، ادخار الاعمال الصالحة، النفس، معاتب نفسه، ذكر الموت، التحريض على الصبر، الاسلام والتسليم لامر الله تعالىٰ، فى غفلة الانسان، فى ذم الدنيا حلو الدنيا مرّة الآخرة، طباع اهل عصره، علىٰ مات الصديق الوفى، فى تنديد الكذب، الحياة الساذجة نعمة للانسان، اسرار الحياة الناجحة، اهمية الاصل للفروع، نصيحة الزمان لاهله، الوصايا والعبر، كثرة الكلام خيبة، الامثال البليغة المتفرقة. فى الاغرباء بالتوبة، الوعظ بدون العمل، قصة عبرية ـ ...

ڈاکٹر علی محمد خسرو کی وفاتِ حسرت آیات

امتِ اسلامیۂ ہند میں سب سے پہلے سر سید احمد خان، بانیٔ مسلم یونیورسٹی، علیگڈھ سے جدید تعلیم حاصل کرنے کی آواز بلند کی جس کے نتیجہ میں ایک دَور اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور ہوا، جس میں ایک نمایاں اور عہد آفریں شخصیت ڈاکٹر علی محمد خسرو کی ہے۔

ڈاکٹر خسرو سید امین الدین چشتیؒ کے صاحب زادے اور نواب جعفر یار جنگ بہادر کے نبیرہ تھے۔ آپ کا خاندانی تعلق حیدرآباد دکن سے ہے۔ آپ نے اپنی عملی زندگی کی شروعات عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبۂ مالیات سے کی۔ آپ کئی ایک کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ قومی منصوبہ بندی کمیشن کے چیرمن تھے۔ اور مغربی جرمنی میں سفارت کی خدمات انجام دیں۔ اور حکومت ہند کی کئی ایک کمیٹیوں کے ممبر تھے۔ ریزرو بینک آف انڈیا کی دیہی معیشت سے متعلق کمیٹی کے ممبر تھے

ماہ آگست ۲۰۰۳ء کو سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا ڈاکٹر سید شاہ غلام عثمان قادری مدظلہٗ ناظم دار العلوم لطیفیہ، سجادہ نشین خانقاہ قطب ویلور کے ساتھ خاندانی روابط ہیں۔ جس کے باعث اس صدمہ جانکاہ کا اثر حضرت سجادہ نشین کو خصوصی طور پر ہوا۔ دار العلوم لطیفیہ میں مرحوم کے ایصال ثواب کے لیے مجلس منعقد ہوئی۔ اللہ تعالےٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل اور اجر جزیل عطا فرمائے۔ امین

خاصۂ خاصانِ رُسُل

مولانا الحاج سید شاہ محمد عمر آمر کلیمی چشتی القادری۔ مدراس۔

محمدؐ مصطفیٰؐ کا نام جب اک بار آتا ہے
تصوّر میں نکھر کر عالِم کردار آتا ہے

حلاوت وہ ہے پائی نامِ سرکارِؐ دو عالم میں
تصدّق اس پہ ہونے کو مرا گھر بار آتا ہے

شریعت[1] نے مجھے روکا وگرنہ حال تو یہ ہے
خیالِ سجدۂ احمدؐ مجھے ہر بار آتا ہے

اطاعت ہے محمدؐ کی اطاعت حضرتِ حق کی
عنایت میں محمدؐ کی نظر غفّار آتا ہے

زماں وہ ہے مکاں وہ ہے مکینِ لامکاں وہ ہے
وجودِ ذرّہ ذرّہ بن کے مرا سرکار آتا ہے

بظاہر پردہ فرمایا ہے تو نے احمدِ مرسلؐ
حقیقت کی نظر میں پھر نظر ہر بار آتا ہے

وجودِ عالَمِ امکاں ہے نورِ محمدؐ سے
وہی اک نورِ حق بن بن کئی انوار آتا ہے

تجھے اے رحمتِ عالمؐ قسم ہے رحمتِ حق کی
اسے مت چھوڑ آقا یہ بحالِ زار آتا ہے

جواب[2] آمر کو یہ آیا سرِ تسلیم خم کر لے
بلاوا اس کو جو ہے لائقِ دربار آتا ہے

۱؎ اس شعر میں شعریت اور شریعت کو حضرت مصنف دامت برکاتہم نے زبان دے دی ہے۔ ان کے علاوہ عشق صادق کو بھی بہترین پیرایۂ اظہار دیا ہے۔ مخفی مبادا کہ شریعتِ مصطفویؐ میں غیر خدا کو سجدۂ تعظیمی کرنا حرام اور گناہِ کبیرہ ہے۔ لہٰذا ہر بار سجدۂ احمدؐ کا خیال آنے کے باوجود حضرت والا دامت برکاتہم اس خیال کو عملی جامہ پہنانے سے رُکے ہوئے ہیں۔ ۲؎ عالَمِ خیال میں مدینہ بلانے کی التجا پر جو جواب ملا اسے قالبِ شعر میں ڈھالا گیا ہے۔

پیش کش:

○ اے۔ آر۔ مبشر احمد آمری و اے آر اقبال احمد آمری۔ ترنامل

نعت

سیّد سراج الدّین منیرؔ حیدرآبادی

صفات و ذات کا مظہر نشانِ بے نشاں تم ہو
خدا شاہد خدائی کی بہارِ جاوداں تم ہو

صدائے کُن کا مصدر ہو مشیّت کی زباں تم ہو
بنائے کُن فکاں وجہِ مکان ولامکاں تم ہو

محمّد مصطفٰے صلّی علٰی نورِ جہاں تم ہو
یہاں تم ہو، وہاں تم ہو، عیاں تم ہو، نہاں تم ہو

کھلا مجھ پر یہ عقدہ مَارَمیتَ اِذْ رَمیتَ سے
جہاں تم ہو وہاں رب ہے، جہاں رب ہے، وہاں تم ہو

خدا کی یاد تو کرتا ہے اک عالم مگر اے دل!
خدا کرتا ہے ہر دم یاد جس کو بے گماں تم ہو

جسے پہچان ہو خود کی وہی پہچان سکتا ہے
کہ تفسیر ھُوَ فِی شَانٍ تنویرِ جہاں تم ہو

زبانِ حال سے گویا ہے ہر ذرّہ منیرؔ اس جا
جہانِ رنگ و بُو کی جانِ جاں روحِ رواں تم ہو

پیش کش: سید علی احمد قادری کلیم حیدرآبادی

نعتِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

حبیبِ کبریا خوابیدہ یارِ غارؓ کے پہلو

یس. محمد یوسف شمّاس اسٹیشن سوپرنٹنڈنٹ (یس سی ریلوے) ادھونی (آندھرا پردیش)
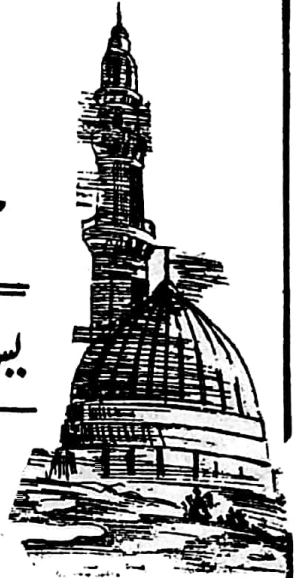
ہے روشن روئے انور گیسوئے خمدار کے پہلو
صحابہؓ جیسے تارے احمدؐ مختار کے پہلو

نمایاں سبز گنبد اک حسیں مینار کے پہلو
بہارِ خلدِ طیبہ کے در و دیوار کے پہلو

ستارے چاند سورج کہکشاں اَوجِ ثریا سب
دو عالم کو سمیٹے ہیں رُخِ انوار کے پہلو

تنا جالا تھا مکڑی نے کبوتر نے دیئے انڈے
حُبیبِؐ کبریا خوابیدہ یارِ غارؓ کے پہلو

اذیّت سانپ کے کاٹے کی آنکھوں سے رواں آنسو
وہ یارِ غارؓ نے چھوڑے نہ اپنے یارؐ کے پہلو

نہ بخشا اپنے بیٹے کو جو وقت امتحاں آیا
یہی فاروقیؓ حُسنِ عدل کے معیار کے پہلو

غنی ہیں پیکرِ جود و کرم ہیں جامعِ قرآن
یہ ذوالنّورینؓ کے عفت حیا کردار کے پہلو

ہر اک غزوہ میں جن کی ہی شجاعت کا چلا سکّہ
درِ خیبر نے دیکھے حیدرِؓ کرار کے پہلو

اُحد ہے جبلِ طائف ہے حرا ہے ثور ہے فاراں
ہیں کرنیں نُور کی پھوٹیں انھیں کہسار کے پہلو

عجب آئینِ دربارِ حبیبؐ کبریائی ہے
غلاموں نے بھی ہے پائی جگہ سردار کے پہلو

ہے جس دیوار سے ملحق نبیؐ کے گھر کی دیواریں
مجھے بھی اے صبا لے چل اسی دیوار کے پہلو

ہر اک مومن مرے سرکارؐ کا شیدائی ہے شمّاس
محبت سے عیاں ہر نعت کے اشعار کے پہلو

منقبت

سیدنا غوث الاعظم دستگیرؒ

سید سراج الدین منیر حیدر آبادی

چشم بینا دلِ حق نگر مانگنا   طاقتِ دید تاب نظر مانگنا
مانگنا مانگنا مختصر مانگنا   جلوۂ یار آٹھوں پہر مانگنا
شام جس کی نہ ہو وہ سحر مانگنا
غوث کا مرتبہ دیکھ کر مانگنا

سوزِ دل، درد و غم چشمِ تر مانگنا   جادۂ حق کا زادِ سفر مانگنا
آگہی ذات کی بے خطر مانگنا   مانگنے کا مزہ جان کر مانگنا
اُن کے قدموں پہ تو رکھ کے سر مانگنا
غوث کا مرتبہ دیکھ کر مانگنا

سوزِ دل نالۂ پُر اثر مانگنا   خوگر درد دردِ جگر مانگنا
جلوۂ ذات اے دیدہ ور مانگنا   سالکِ راہ نقدِ نظر مانگنا
تختِ کسریٰ نہ عمرِ خضر مانگنا
غوث کا مرتبہ دیکھ کر مانگنا

جذبۂ دید! ذوقِ نظر مانگنا   شوقِ دیوانگی! دشت و در مانگنا
چشمِ دل! جلوۂ معتبر مانگنا   جستجو! خوب سے خوب تر مانگنا
مانگنا شامِ غم کی سحر مانگنا
غوث کا مرتبہ دیکھ کر مانگنا

بہرِ سیرِ فلک بال و پر مانگنا　　اِذنِ تسخیرِ نجم و قمر مانگنا
وسعتِ قلب و فکر و نظر مانگنا　　مانگنا ہو اگر اس قدر مانگنا

دولتِ فقر و علم و ہنر مانگنا
غوث کا مرتبہ دیکھ کر مانگنا

مال و دولت نہ دنیا نہ زر مانگنا　　شان و شوکت نہ لعل و گہر مانگنا
تختِ شاہی نہ تیغ و سپہر مانگنا　　مانگنا حُبِّ خیر البشر مانگنا

دیدۂ کور نورِ بصر مانگنا
غوث کا مرتبہ دیکھ کر مانگنا

ذوقِ پرواز ہے؟ بال و پر مانگنا　　حوصلہ دید کا ہے؟ نظر مانگنا
عزمِ دار و رسن ہے؟ تو سر مانگنا　　آرزوئے حرم ہے؟ تو در مانگنا

دانش و فکر و علم و خبر مانگنا
غوث کا مرتبہ دیکھ کر مانگنا

شہرِ بغداد میں جب ہو تیرا گذر　　یہ وظیفہ زباں پر ہو شام و سحر
المدد غوثِ اعظم شہِ بحر و بر　　مجھ خطا کار پر ہو کرم کی نظر

جا کے روضہ پہ با چشمِ تر مانگنا
غوث کا مرتبہ دیکھ کر مانگنا

وہ جو چاہیں تو اسرارِ لوح و قلم　　تجھ پہ کھل جائیں پل میں خدا کی قسم
وہ ازل سے ہیں محبوبِ ذاتِ قِدَم　　اُن کے ہاتھوں میں دامانِ شاہِ اُمم

اُن سے فیضانِ خیر البشر مانگنا
غوث کا مرتبہ دیکھ کر مانگنا

اُن کی نسبت سے ہے نسبتِ مصطفیٰ　　اُن کا دامن ملے تو ملے گا خدا
اُن کی نظروں میں ہیں ایک شاہ و گدا　　دے کے چوکھٹ پہ یا غوث کی تو صدا

ثمرۂ فقر و فیضِ نظر مانگنا　　غوث کا مرتبہ دیکھ کر مانگنا

نائبِ مصطفےٰ ! محیِ دینِ مُبین !　　آفتابِ ہدایت ہیں وہ بالیقین
ذکر شاہوں کا کیا اے منیرِ حزیں　　اولیائے جہاں اُن کے زیرِ نگیں

بہرِ نورِ بصر خاکِ در مانگنا
غوث کا مرتبہ دیکھ کر مانگنا

پیش کش: سید صفی محمد قادری عامر

نعت شریف

علیم صبا نویدی

بات بے شک حضور، نا ممکن
میں رہوں دُور دُور، نا ممکن

کالی کملی ہے جب تلک سر پہ
فکرِ یوم النشور، نا ممکن

شاہ بطحیٰؐ سے دُور میرا دم
نکلے ربِّ غفور، ناممکن

آپؐ کے ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے
قیدِ ہو لاشعور، ناممکن

پائے صبر و قرار اور کہیں!
یہ دلِ ناصبور، ناممکن!

ذکرِ خیر الوریٰ سے ہٹ کے صبا
دل میں ہو جائے نور، ناممکن

منظوم نذرانۂ عقیدت

بہ یادِ شیخ المشائخ اعلیٰ حضرت

مولانا مولوی ابوالنصر قطب الدّین سیّد شاہ محمّد باقر قادریؒ بہ موقعہ سالانہ فاتحہ

سجادہ نشین، مکان حضرت قطب ویلور

اثرِ خامہ: علیم صبا نویدی

سب کو یادِ حضرتِ باقر نے غمگیں کردیا
بوئے عہدِ رفتگاں سے سب کا دامن بھر دیا

آپ کی چاہت سے سب کے دل منوّر ہیں ابھی
قربتوں کے نور سے سینے معطّر ہیں ابھی

واقعی اوصاف تھے موصوف کے آفاق گیر
آپ تھے حضرت مکاں ویلور کی روشن لکیر

آپ ہی کے فیض سے ذرّوں کو تابانی ملی
آپ کی نظرِ کریمانہ سے روشن تھے سبھی

آپ کی روشن خیالی، آپ کا روشن ضمیر
گلشنِ حضرت مکاں ہے آج بھی بے نظیر

آپ کا وصفِ جمالی، ذہن و دل میں نقش گر
آپ کے پاکیزہ جذبوں کی تجلّی معتبر

آپ کے کردار آئینہ صفت اور بے مثال
واقعی تھا نور پرور آپ کا جاہ و جلال

آپ سے چمکا بہت اسلاف کا نوری لباس
درس گاہِ علم کا قائم رہا دینی اساس

آپ قربی، ذوقی و محوی کے تھے نورِ نظر
آپ ہی کی نیکیاں چاروں طرف ہیں جلوہ گر

فیضِ باقر سے ہوا ویلور بھی دارالسرور
آستانہ آپ کا آماجگاہِ رنگ و نور

ایسا لگتا ہے کہ حضرت آج بھی موجود ہیں
روحِ قدسی کے نظّارے اب بھی لامحدود ہیں

ہم کو اس احساسِ فرقت میں بھی ہے قربت کا ذوق
دیکھیے کنجِ لحد سے بھی ہے حضرت کا ذوق

حضرتِ باقر ملیں گے دیکھ اپنے آس پاس
زندہ رہتے ہیں ولی، اے دل نہ ہونا تو اداس

واصلِ حق کے لیے کرنا دعا سنّت بھی ہے
رحمتِ ربِّ دو عالم روح پر رحمت بھی ہے

رحمتوں کی اس فضا میں ہاتھ اٹھاتا ہوں صبا
سب کہیں آمین، جب کہ مغفرت کی ہے دعا

پیشکش: ٹمل ناڈ اردو پبلی کیشنس۔ ماؤنٹ روڈ چینئی۔ مورخہ ۶ اگسٹ ۲۰۰۳ء۔ بروز چہار شنبہ

تصنیفِ لطیف ماہر علوم دین طریقت، واقفِ رموز معرفت وحقیقت حافظ قرآن، مجددّ جنوب حضرت شاہ محی الدین سید شاہ عبداللطیف نقوی قادری المعروف بہ قطب ویلور قدس سرہٗ العزیز المتوفی سنہ ۱۲۸۹ھ

نوادر الدقائق ترجمہ جواہر الحقائق

ترجمہ وتشریح

حضرت مولانا مولوی قاری ڈاکٹر حکیم سید افسر باشاہ صاحب قاسمی صبغۃ اللّٰہی۔ شفاء ڈسپنسری۔ بنگلور روڈ۔ حضرت مکان۔ ویلور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سُبحٰنکَ لاعِلمَ لنا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم

حمد تیری اے خدائے لم یزل — ہے یہ اپنی زندگی کا ماحصل
نام تیرا میرے دل کی ہے دوا — ذکر تیرا روح کی میری شفاء

جب زباں پر محمدؐ کا نام آگیا — دوستو زندگی کا پیام آگیا
آپؐ کی مدح انساں کیا کر سکے؟ — عرش سے جب درود وسلام آگیا

ہر قسم کی تعریف ثابت ہے اس پاک پالن ہار کے لیے جو ساری کائنات کا پروردگار ہے اور ہزاروں ہزار بار درود وسلام اس دربارِ گہربار اور خلاصۂ کائنات فخر موجودات محسنِ اعظم فخرِ آدم صلے اللّٰہ علیہ وسلم پر جن کے طفیل و بدولت اسلام کا بول بالا ہوا، اور شرک وضلالت، کفر وجہالت کا منہ کالا ہوا۔

الحمد للہ زیرِ نظر کتاب "نوادر الدائق" ترجمہ "جواہر الحقائق" کی یہ تیرھویں قسط ہم آپ کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ جو کتاب "جواھر الحقائق" کے فائدہ نمبر چھ (۶) کے بقیہ حصہ کا ترجمہ ہے۔

اس ترجمہ کے تعلق سے عرض ہے کہ اس کے اندر اتنی رعایت اور کوشش کی ہے کہ ترجمہ لفظی اور بامحاورہ ہو اور جہاں عبارت دقیق اور مشکل ہوتی ہے، وہاں عبارت کا خلاصہ یا حاصلی ترجمہ کر دیا ہے۔ پھر بھی بعض مشکل اور ادق الفاظ کے افہام و تفہیم میں دشواری محسوس ہونے پر حتی الوسع قوسین کے اندر اس کی تسہیل کر دی گئی ہے۔ جو راقم الحروف مترجم کی طرف سے خفیف اضافہ اور فائدہ ہے۔ اور جہاں "تشریح" کا مستقل عنوان ہے، وہاں مترجم کی جانب سے تفہیم و تشریح کی ایک ادنیٰ کوشش سمجھیں۔

زیرِ نظر کتاب "نوادر الدقائق" ترجمہ "جواہر الحقائق" کی یہ تیرھویں قسط الحمد للہ درج ذیل عناوین پر مشتمل ہے:

۱ ملکی موکل۔
۲ وجودِ ارواح قبل الابدان۔
۳ تخلیقِ روح بعد الابدان۔
۴ نفسِ کل۔
۵ صورِ علمی۔
۶ عقل کل، نفس کل۔
۷ عقول و نفوس کا اجمال و تفصیل۔
۸ روحِ عالم، قلبِ عالم، انسان کبیر۔
۹ کائنات کی ہر چیز میں روح اور جان۔
۱۰ تشریحِ مترجم اور پہلا جواب۔
۱۱ مسئلہ۔
۱۲ دوسرا جواب۔
۱۳ تیسرا جواب۔
۱۴ نباتات و جمادات اور اعمال صالحہ کی گفتگو۔
۱۵ تشریحِ مترجم۔
۱۶ مسئلہ۔

۱ ملکی موکل

(اب آگے حضرت قطب ویلور قدس سرہٗ اپنی کتاب "جواھر الحقائق" میں فرشتوں کے اقسام بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ) غرض علویات، سفلیات، بسائط اور مرکبات میں سے ہر ایک چیز پہ ملکی موکل ہوتا ہے۔ جب تک کہ اس کا وجود ملکوتی نہیں ہوتا اس کا جسم وجود منصور (مدد کیا ہوا جسم) نہیں ہوتا۔

؎ جس طرح جسم کے لیے سایے کا ہونا ضروری ہوتا ہے، اسی طرح آدمی کے لیے جان کا ہونا بھی ضروری سمجھ۔ بے شخص سایہ کو کیسے ہستی میں شمار کر دگے؟ تاکہ فسبحان الذی بیدہ ملکوت کل شیئ: (پاک ہے وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں ہر چیز کی ملکیت ہے۔) اور اس ذات کے جمال و کمال سے پردہ اٹھے اور اس معنی اور مطلب میں کھلا ہوا نہ ہووے اور یہ بڑے رازوں میں سے ایک راز ہے۔ رمز ہے اور روئے زمین پر اس کے فہم و ادراک کا احاطہ کرنے والے بہت ہی کم ہیں۔

۲ وجود ارواح قبل الابدان یہ ملکوتی نفوس، جبروتی عقول کی طرح ابدان و اجسام سے پہلے ہی موجود ہیں۔ علامہ قیصریؒ شرح "قصیدۃ الفارضیۃ" میں رقم طراز ہیں:

روح بدن سے پہلے موجود ہے۔ اہلِ حق کے نزدیک ثابت ہے۔ جیسا کہ اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: ان اللہ خلق الارواح قبل الاجساد بألفی عامٍ: (بے شک اللہ تعالیٰ نے جسموں کو پیدا کرنے سے دو ہزار سال پہلے ہی روحوں کو پیدا فرما دیا ہے۔) حضرات اشراقیین اسی کی طرف مائل ہیں اور زور لگاتے ہیں۔ و نیز حکماء نے بھی یہی کہا ہے۔ انتہی: (شرح قصیدۃ الفارضیۃ)

۳ تخلیق روح بعد الابدان اور بعض حضرات کا یہ قول ہے کہ بدن کے پیدا کرنے کے بعد ہی روح پیدا کی گئی اور پھونکی گئی۔ چنانچہ امام حجۃ الاسلام (حضرت امام غزالیؒ رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے (اور یہی مسلک ہے۔) اسی لیے حدیث شریف میں مخلوق کو تقدیر سے تفسیر کی گئی ہے۔ پس اسی سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ عقل کل (انسان) ایک ایسی روح ہے جو ارواح مہیّمہ (وہ ارواح جو خدا کی ذات کے ساتھ شیفتہ فریفتہ اور عاشق گم گشتہ ہوتے ہیں) کے اخیر صف میں ہے۔ اور وہ حق تعالےٰ و سبحانہٗ و تعالیٰ کے علم اور اس خاص تجلّی کے ساتھ اس کی ایجاد و اختراع ہے۔ اور اس کی ذات اور تمام اشیاء (چیزوں) میں منقش ہو چکی ہے (اور صورت و شکل اختیار کی ہوئی ہے۔) اور تمام جنّتیاں جنّت میں اور دوزخیاں دوزخ میں داخل ہونے تک نیز موت کا ذبح کرنا یہ سب ہو کر ہی رہے گا۔ جو حق تعالیٰ شانہٗ کے علم میں (پہلے سے) موجود ہے۔

۴ نفس کل نیز وہ ارواح مہیّمہ (جو خدا کی ذات پر شیفتہ فریفتہ ہوتی ہیں) کو الگ الگ دیکھے گا اور خود کو روح سے اور قوتِ ممیزہ سے مرکب اور خود کو تمام ارواح سے ممتاز اور الگ پائے گا۔ اور ہر پیدا ہونے والی چیز میں بحیثیت اجمال اور کلیتہ عقل و تمیز رکھی ہے۔ پھر اس عقل کی موزونیت اور مناسبت علمی صورتوں کے مرتبہ میں حق سبحانہٗ و تعالیٰ کو معلوم ہی ہے۔ اور اس مقام پر اس میں اور حق تعالےٰ کی ذات میں کسی قدر مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر حق تعالیٰ شانہٗ عقلِ اوّل (کنایتہً حضرت جبرئیل علیہ السلام) پر اپنی تجلّی فرماتے ہیں، اس کے بعد اس تجلّی کے نور سے برکتِ خاص اس ذات پر جو حدوثی (نئی تخلیق و وجود کی) کثافت سے متصف تھی ایک سایہ ظاہر ہوگا جسے نفسِ کل کہتے ہیں۔

اور اشیاء کی شکل و صورت بحیثیت تفصیل و جزئیت اور بغیر فکر و تامل یعنے غور و خوص کے بغیر ہی ثابت ہے جو قلم اعلیٰ سے لکھی ہوئی لوح محفوظ میں نقش کی ہوئی اور کھدی ہوئی اور بغیر کسی تغیّر و تبدل کے محفوظ (و موجود) ہے۔

حضرت شیخؒ "فتوحات" کے گیارھویں باب میں فرماتے ہیں کہ "لوحِ محفوظ میں ہر وہ نقش و نشان بھی اسی طرح اثر انداز ہوگا، جس طرح رحمِ مادر میں کودتا ہوا منی کا قطرہ داخل ہوتا ہے۔" انتہیٰ (فتوحات۔)

۵ **صورِ علمی** عقلِ کل اور نفسِ کل کی علمی صورتیں جو خارج سے کھینچی ہوئی اور حقائق سے الگ نہیں ہیں جب تک کہ غیر حقائق خود ہی موجود ہوں، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ افاضہ (فیض پہنچانا) اور ایجاد حقائق علمیہ (علمی حقائق کی افزائش و پیداوار) اس کے اندر دونوں (پہلے سے) موجود ہیں۔ پھر ان دونوں کے لیے بعینہ یہی فیض پہنچانے والی صورتوں کا علم حاصل ہے۔ پھر یہ فیض پہنچانے والی صورتیں ان دونوں (افاضہ اور ایجاد) میں ایسی ہیں جیسی اولادِ آدمؑ۔ حضرت آدم و حوا علیہما السلام کے مابین (نسبت) ہے اور جو کچھ بھی معنوی نکاح کے ذریعہ ان دونوں (میاں بیوی) کے درمیان خارج میں ظاہر ہوگا وہ صورِ علمیہ کا سایہ متصوّر ہوگا۔

۷ **عقلِ کل نفسِ کل** پس عقلِ کل معنوی آدم ہیں۔ چنانچہ ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام ایک صورت ہے اور نفسِ کل یہ معنوی حوّا ہیں۔ چنانچہ ام البشر حضرت حوّا علیہا السلام ایک صورت ہے۔

اور عقول و نفوس (عقلیں اور جانیں) یہ درحقیقت اس کی جزئی نتائج ہیں۔ اور بنی آدم و حوا (آدمؑ و حوّاؑ کی اولادیں) یہ معنوی طور پر ہیں۔ چناں چہ ذکور و اناث (مرد اور عورت کی جنس) یہ اولاد آدم کے نتائج ہیں اور اولاد آدم و حوا علیہما السلام (یہ دراصل) صورت ہے۔

۸ **عقول و نفوس کا اجمال و تفصیل** عقول اپنے اندر مجمل و مختصر (معلومات رکھتی) ہیں۔ (برخلاف اس کے) نفوس تفصیل (کے قائل) ہیں۔ اور عقول اقلام (قلمیں) رکھتی ہیں اور نفوس الواح۔ اور وہ عقول فاعل (کام کرنے والے) ہیں اور یہ نفوس منفعل (کام کئے ہوئے) ہیں۔ اور وہ مأثر (اثر انداز) ہیں اور یہ متاثرہ یعنے (اثر قبول کرنے والے۔)

علامہ قیصریؒ نے شرح "القصیدۃ الفارضیۃ" کے مقصد اول میں فرماتے ہیں:

"عقلِ اول (یہ دراصل) حقیقی حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اور نفس کلیہ یہ حقیقی حضرت حوا علیہا السلام ہیں۔ اور عقول و نفوس یہ ان دونوں کی اولاد۔ خلاصہ اور نتیجہ ہے کوئی الگ نہیں ہے۔ اور آدم علیہ السلام ابو البشر ہیں اور حضرت حوا علیہا السلام یہ عالم عقول اور نفوس مجردہ کی شکل و صورت ہے۔ جو عالم الملک والشہادۃ میں عالم جبروت سے مشہور و موسوم ہے۔" انتہیٰ: (القصیدۃ الفارضیۃ۔)

پس عقلِ کل سے نفسِ کل کی شاخیں اور شعبے اور عقول و نفوس جزئیہ کے شعبے اور شاخیں انہی دونوں سے تعلق رکھتے ہیں

۸ **روحِ عالم، قلبِ عالم ۔ انسان کبیر** یہ جاننا چاہیے کہ عقلِ کل (حقیقت میں) روحِ عالم ہے ۔ چناں چہ عقول جزئیہ، فلکی اجسام کے ارواح اور عنصر بسیط اور مرکبہ ہیں ۔ اور نفسِ کل یہ قلبِ عالم ہے ۔ چناں چہ قلوبِ اجسام فلکی و عنصری بسیطہ اور مرکبہ کے نفوس جزئیہ ہیں۔

علامہ قیصریؒ ''شرح الفصوص'' کے مقدمہ میں فرماتے ہیں : ''عالم کبیر اور اس کے حقائق کی طرف عقلِ اول کی نسبت بعینہ ایسی ہے جیسی روح انسان کا تعلق اس کے جسم و بدن اور قوتوں سے ہے ۔ کیوں کہ نفسِ کلیہ یہ عالمِ کبیر کا قلب (دل) ہوتا ہے ۔ جس طرح کہ نفسِ ناطقہ انسان کا دل (اور خاصہ) ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ عالم کو ''انسان کبیر'' سے نامزد کیا گیا ہے'' انتہیٰ (مقدمہ شرح الفصوص)

۹ **کائنات کی ہر چیز میں روح اور جان** (اب یہاں سے یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہوتی ہے کہ تمام مخلوقات اور کائنات کے ہر ہر ذرّے اور کل پرزے میں سے) ہر ایک چیز میں جواہر و اعراض میں سے جبروتی روح موجود ہے ۔ جسے عقل کہتے ہیں ۔ اور ان کے اندر ایک ملکوتی دل بھی ہے جسے ''نفسِ مجرد'' سے یاد کیا جاتا ہے ۔ (غرض) آسمان و زمین، دریائیں، پہاڑیں، درخت و پتھر وغیرہ ایسی عجیب و غریب انوکھی بات اور راز کی بات میں مضمر ہیں، جنھیں نفسِ مجرد کہتے ہیں (اور یہ کائنات اور ان کی موجودات و ذرّات وغیرہ اپنے اندر) حیات، علم، ارادہ، قدرت، سمع و بصر وغیرہ (سننے دیکھنے وغیرہ وغیرہ) کی طاقت رکھتے ہیں ۔ و نیز وہ اپنے پروردگار کی تسبیح و عبادت بھی کرتے ہیں ہیں ۔ (اس بات کی دلیل و شہادت کے لیے سنیے یہ:) آیات کریمات : فسبحٰن الذی بیدہ ملکوت کل شیئ (پس پاک ہے وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں ہر چیز کی بادشاہت ہے ۔) وان من شیئ الا یسبح بحمدہ ولکن لا تفقھون تسبیحھم (کائنات کی ہر چیز اپنے پروردگار کی تسبیح و تعریف میں لگی ہوی ہے مگر تم ان کی اس تسبیح و عبادت کو سمجھ نہیں سکتے ۔) اور کلٌ قد علم صلواتہ و تسبیحہ (ہر چیز اپنی نماز و عبادت کو خوب جانتی اور ذکر میں لگی ہوی ہے ۔)

یہ مذکورہ آیات ِ کریمات تمام مخلوقات کی طرح اپنے اندر جان و رُوح ہونے اور ذکر کرنے کی (اچھی طرح) خبر دیتے ہیں ۔

۱۰ **تشریح مترجم اور پہلا جواب** آگے حضرت قطب ویلور قدس سرہٗ العزیز نے احادیث صحیحہ متواترہ سے بھی یہ ثابت کیا ہے کہ کائنات کی ہر چیز میں جان ہے اور نہ صرف جان ہے بلکہ وہ تسبیح و تقدیس میں لگی ہوی ہے ۔ گو انسان کی یافت و پرداخت اور آگہی اور رسائی وہاں تک نہیں ہے ۔

یہاں وقت کا ایک اشکال فرو پیش کرنا ہے جو یقیناً حالات حاضرہ اور ضرورت ظاہرہ سے تعلق رکھتا ہے ۔

اور جیسے اسلام دشمن عناصر بین اکثر مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم گوشت کھاتے ہو اور یہ بتاؤ کہ کسی کی جان لینا کیا یہ پاپ نہیں ہے ؟ اس طرح کے حربوں سے مسلمانوں کے دین و ملّت میں رخنہ اندازی سے کام لیتے ہوئے انھیں پھانستے ہیں۔ ملّت کی بعض سادہ لوح مسلم برادری ان کے اس جال میں آجاتی ہے۔ اور اپنی اس لاعلمی کی بنا پر گویا اسلام کے اس نظریۂ فطرت سے بسا اوقات وہ بدظن بھی ہوجاتی ہے۔ العیاذ باللہ۔

احقر مترجم نے اپنے مضمون "اشکال، جواب اشکال" میں اس کا تفصیلی جواب اور جائزہ لیا ہے۔ تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس مضمون کا کچھ خلاصہ یا اقتباس پیش کروں۔

ا۔ **پہلا جواب** "اسلام ہی وہ مکمل نظام حیات ہے جس کی رو سے اعتدال کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ حق و صداقت عدل و دیانت کا بول بالا ہوتا ہے اور جہاں رحم و کرم جود و سخا کے احکامات ہیں کچھ حدود و قیود کی پابندیاں بھی۔ موذی جانوروں اور حشرات الارض کو دیکھ کر چھوڑ دینا یہ ان پر رحم کرنا نہیں ہے۔ کیوں کہ ان کے وجود سے دوسروں کو نقصان پہنچنے کا قوی امکان، اندیشہ اور خطرہ ہے۔ اس لیے انھیں مار دینے کا حکم فرمایا ہے کہ اقتلوا المؤذیین اجی تکلیف دینے والے جانداروں کو مار ڈالو۔ جیسے سانپ، بچھو، چیتا اور شیر وغیرہ۔

(۱) "میں پوچھتا ہوں کہ بکری، مرغی، گائے اور بھینس بے شک جانداروں میں سے ہیں۔ ان کا ذبح کرنا پاپ ہے ظلم ہے تو پھر ان لوگوں کے گھر جو اُن پر رحم کھاتے ہیں، سانپ، بچھو، شیر اور چیتے کو چھوڑ آؤ دیکھیں وہ خاموش بھی بیٹھتے ہیں یا شور مچاتے ہیں۔ اگر وہ مار دینے ہی پر آمادہ ہیں اور یقیناً ہیں تو پھر ان سے کہیے گا کہ ایک جاندار کی آپ نے جان لی ہے یہ تو پاپ ہے اور صریح ظلم ہے"

(۲) "جتنے درخت ہوتے ہیں وہ سب کے سب زندہ اور جاندار ہوتے ہیں۔ اس اصول سے ہر درخت زندہ ہے پھر اس سے سبزی کاٹنا، پھل پھول توڑنا کب روا ہے؟ اور کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ بھی پاپ میں داخل ہے اور گناہ کی بات ہے تو آپ کے اس اصول سے کوئی سبزی یا پھل نہیں کھائیں گے۔ یہ بھی ایک طرح کا درخت پر ظلم ہوا۔"

(۳) "چاول، گیہوں، دال اور بھات وغیرہ کے اگانے میں بیلوں کی مدد ضروری ہوتی ہے۔ ان کے بغیر اناج کا وجود نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

کاشت کاری، آب پاری میں بیلوں سے کام لینا، ہل جوتنا، پانی سینچنا، دودھ دوہنا اور ان سے محنت لینا وغیرہ سب پاپ میں داخل ہے۔ پھر اناج ہی نہ اگائیں۔ "نہ رہے بانس نہ بجے بانسری"

(۴) "گدھے، گھوڑے، ہاتھی، اونٹ، خچر، بیل، بھینسا وغیرہ جانور سواری کے لیے پیدا کئے گئے ہیں۔ ان پر بوجھ لادنا اور

سوار ہونا، یہ طبعی اور فطری تقاضوں کے تحت ہی ہے۔"

غرض یہ جانور محنت کرنے کی خاطر پیدا کئے گئے ہیں اور ان کی اس محنت کے نتیجہ میں ہمیں غذا میسر ہوتی ہے ورنہ نہیں۔ اور اگر ان پر ترس کھائیں اور رحم کھائیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ سب بھوکے مریں۔"

"یہ نظامِ کائنات ہے اور خالقِ کائنات نے ہمیں ان سے کام لینے ہی کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا جن سے کام لینا ہے ان سے کام لیں گے اور جنھیں غذا بنوانا ہے انھیں غذا بنوائیں گے اور جن پر سوار ہونا ہے ان پر سوار ہوں گے یہی عین اطاعت و فرمانبرداری ہے۔"

"بہرحال ساری کائنات ہماری خاطر پیدا کی گئی ہے۔ جیسا کہ حدیثِ شریف میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے: انما الدنیا خلقت لکم وانکم خلقتم للآخرۃ: (ساری دنیا تمہارے لیے ہے اور تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔) تو اس لحاظ سے ساری کائنات کے ہر ہر ذرات بھی ہمارے ہی لیے ہیں تو ہر جاندار چیز بھی ہمارے لیے ہے نہ صرف ہر جاندار چیز بلکہ نباتات، جمادات، حیوانات وغیرہ سب ہماری ہی خاطر وجود میں آئے ہیں جو سب کے سب زندہ ہیں اور یادِ الٰہی میں مشغول و منہمک ہیں۔" اسی معنی میں راقم الحروف کے شعر ہیں: ؎

وہ دل ہی کیا کہ جس میں تو یادِ خدا نہیں	وہ زندگی نہیں ہے جہاں بندگی نہیں
ہر ذرّہ کائنات کا کرنے لگا ہے ذکر	سب یاد میں لگے ہیں مگر آدمی نہیں

مسئلہ یہاں حضرات علماء نے ایک باریک مسئلہ یا نکتہ پیش کیا ہے۔ وہ یہ کہ استنجاء کے بعد ڈھیلا لینا ہو تو اسے پہلے زمین پر تین دفعہ آہستہ سے مارنا ہے۔ اس طرح کرنے سے اس کی موت واقع ہو جاتی ہے اور ذکر بھی موقوف ہو جاتا ہے ورنہ وہ ڈھیلا تو یادِ الٰہی میں مشغول ہوگا اور ہم اس سے اپنی ناپاکی یا نجاست دور کریں، یہ تو صریح بے ادبی ہوئی۔ اس لیے علماء نے یہ باریکی بیان فرمائی اور نکتہ پیش کیا ہے۔

تو پھر ہم غور کریں جب مٹی، پتھر، حجر اور شجر سبھی عبادت میں لگے ہوئے ہیں تو ایسی صورت میں ہم مکان کیسے بنوائیں گے؟ رہائش کہاں ہوگی؟ سر کہاں چھپائیں گے؟ چھت کیسے بنے گی؟ لیٹیں گے کہاں، سوئیں گے کس پر؟؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا کوئی حل اور جواب نہیں مل سکتا۔ سوائے اس کے کہ بس خدا کا حکم ہے یہ ساری اشیاء ہمارے ماتحت ہیں اور ہم ان کے مالک ہیں۔ خدا کے حکم سے ان پر ہمارا تصرّف بھی ہے اور تسلط بھی۔ آقا نے ہمیں ان کے استحصال کی بھی اجازت دے رکھی ہے۔ اور استعمال کی بھی۔

مالک الملک نے ان جانوروں کے تعلق سے جہاں ان باتوں کی اجازت دے رکھی ہے۔ وہاں ضرورت سے زیادہ ان پر بوجھ

ناد نے اور انھیں پیٹ بھر کر غذا نہ دینے کی سخت ممانعت بھی کی ہے۔ اور جہاں عمدہ عمدہ لذیذ کھانوں کی ہمیں اجازت دی ہے۔ وہیں ان نعمتوں پر شکر بجالانے کے ساتھ حیوانوں کی طرح خوب پیٹ بھر لینے کی ممانعت بھی کی ہے۔" (اشکال جواب اشکال بتغیر یسیر)

دوسرا جواب

اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ نظام قدرت ہے ایک۔ اصول وضابطہ بھی مقرر ہے جس کے تحت تمام مخلوقات کی تقسیم تین بلکہ چار حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ جو یقیناً فطری اور تخلیقی تقسیم ہے اور وہ اس طرح ہے:

۱۔ جمادات ۲۔ نباتات ۳۔ حیوانات ۴۔ انسانات

پھر اس تقسیم کے بعد ان کے اندر کچھ درجہ بندیاں اور مراتب بھی ہیں۔ اور وہ بھی چار ہی قسم کے ہیں۔ (۱) سب سے اونچا اور بڑھیا۔ ۲۔ اعلیٰ ۳۔ اوسط اور ۴۔ ادنیٰ۔ اس حیثیت سے سب سے کم درجہ کی مخلوقات جمادات ہیں۔ ان کے اوپر نباتات ہیں ان کے اوپر حیوانات اور ان کے اوپر انسانات ہیں۔

اب ان کے درمیان بھی اصول و قانون قدرت کچھ اس طرح ہے کہ ہر ماتحت اور نیچے والی مخلوق اپنے اوپر والی مخلوق کی خوراک اور غذا بنی ہوئی ہے۔ چناں چہ جو ادنیٰ درجہ کی بالکل نچلی ذات کی ہے یعنی جمادات یہ اپنے سے اونچی ذات (نباتات) کے حق میں خوراک بنادی گئی ہے اسی طرح نباتات جو جمادات سے اونچی مخلوق ہے اس کی خوراک اس سے گھٹیا درجہ والی ذات جمادات ہوئی۔ جیسے مٹی، پتھر، بالو اور سنگریزے وغیرہ معدنیات

پھر نباتات کو اس سے اونچی اور بڑھیا مخلوق (حیوانات) کے حق میں غذا مقرر کردیا۔ پھر حیوانات کو بھی اس سے اونچی اور بڑھیا مخلوق یعنی انسانات کے لیے خوراک بنادیا گیا اور ان میں بھی سب کی نہیں بلکہ بعض کی اجازت دے دی اور بعض کی نہیں۔

غرض اس اصول کے تحت یہ معلوم ہوا کہ انسانات، حیوانات کو کھاتے ہیں اور حیوانات، نباتات کو کھاتے ہیں اور نباتات جمادات کو کھاتے ہیں جو ایک فطری تقاضہ اور قدرتی نظام وضابطہ ہے اور جب حیوانات نباتات کو استعمال کریں تو یہ ان کے اصول و قانون کے تحت ٹھیک ہے۔ نباتات، جمادات کو استعمال کریں تو یہ بھی ان کے فطری تقاضہ اور طبعی ضابطہ کے مطابق ٹھیک ہی ہے۔

لیکن حیوانات یعنی انسانات خود حیوانات کی جان لیں، یہ اصول وضابطہ کے مطابق ٹھیک نہیں ہے اس لیے یہاں اپنے خالق و پروردگار کی بارگاہ سے خصوصی پرمیشن (اجازت) بھی لینی پڑتی ہے اور وہ اس طرح سے کہ:

"جب آپ اسلام کے حلال کردہ جانور یا پرندے کو ذبح کرتے ہیں تو دل میں یہ خیال کریں کہ اسے اللہ کے حکم سے ذبح کر رہا ہوں اور اسی کے حکم سے کھا رہا ہوں اور چھری حلق پہ پھیرنے سے پہلے بسم اللہ اللہ اکبر کہہ دیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے اپنے پالن ہار سے اس کی اجازت لے لی ہے اور جب آپ نے اس سے اجازت لے لی تو اب یہ ذبیحہ آپ کے حق میں حلال ہوگیا۔

اگر آپ نے جان بوجھ کر اللہ کا نام نہیں لیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے اللہ کی اجازت کے بغیر ہی جانور کو ذبح کیا ہے۔ اس لیے وہ جانور اب نہ تو آپ کے لیے حلال ہے اور نہ کسی مسلمان کے حق میں حلال ہوگا۔

اس طرح خالق و پروردگار نے جہاں انسان کو اپنی تمام کائنات پر فوقیت و فضیلت بخشی ایک اونچی اور اعلیٰ سطح کے مقام و معیار پر فائز کیا اور اشرف المخلوقات کے خطابِ خاص سے نوازا اور خلیفۃ اللہ فی الارض بنا کر بھیجا وہیں بعض باتوں اور کاموں میں ان کا نام لینے اور اجازت حاصل کرنے کی ذمہ داری بھی سونپی ہے۔ (خلاصۂ اشکال جواب اشکال)

تیسرا جواب " اتنی تفصیل کے بعد ایک اور جواب بھی ہے جو یقیناً فطری اور عقلی ہے۔

اور وہ یہ ہے کہ جس ساخت سے انسانی ڈھانچہ کا وجود بنا ہے اسی ساخت سے اس کی غذا کا تعلق بھی ہے۔ اور انسانی ساخت میں عناصر اربعہ کی آمیزش ہے اور عناصر اربعہ کے ذریعہ گوشت، ہڈی اور پوست کا تعلق ہے تو اس کی غذا میں بھی ان اجزاء کا پایا جانا ضروری ہے اور یہ حقیقت ہے کہ کل شیئ یرجع الی اصلہ " (ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔)

تو پھر اس قانونِ فطرت کے تحت ایک اصل اپنی اصل کی خواہش کرے تو اس کی یہ خواہش کوئی نئی خواہش نہیں ہے بلکہ وہ خواہش خود ظاہر کرتی ہے کہ یہ اس کا فطری تقاضہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی گوشت خوری کوئی حیرت میں ڈالنے والی بات نہیں بلکہ یہ اس کی فطرت کا تقاضہ ہے۔ اور فطرت اور طبعی تقاضوں کو روکنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

جس کی فطرت میں آزادی اور شکار خواہی ودیعت کر گئی ہو اس کی طبیعت میں گوشت خوری بھی ودیعت کر گئی ہے۔ جیسے شیر اور بلی ہے۔ بلی کتنا چھوٹا جانور ہے۔ مگر چوں کہ شکار کرنا اس کی ذات و طبیعت میں موجود ہے اس لیے وہ گوشت ہی کھائے گی۔ شیر گھاس نہیں کھا سکتا بلی گھاس نہیں کھاتی ہے اور انسان تو اشرف المخلوقات ہے اس لیے اس کی طبیعت میں اور زیادہ آزادی ہے تو وہ بھی گوشت کھائے گا۔ اور شکار کرے گا۔

اس کے برخلاف بیل، بکری، گائے اور بھینس ہیں ان کی ذات اور طبیعت میں آزادی نہیں ہے فطرتاً غلامی ان کی قسمت میں لکھی جا چکی ہے اس لیے وہ ہمارے تابع اور مددگار ثابت ہوئے ہیں اور غلامی ہی کی حیثیت سے رہ رہے ہیں۔ وہ گوشت نہیں کھائیں گے۔ ان کی غذا محض گھاس، پھوس، ساگ، بھاجی، پتوں اور سبزی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اب جو لوگ گوشت خوری سے انکار کرتے ہیں وہ گویا اپنے آپ کو فطرت کے خلاف چوپایوں میں شامل کرانا چاہتے ہیں اور آزادی سے ہٹ کر غلامی کا طوق اپنی گردنوں میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ بات واضح ہے اس کے سوا اور کوئی مطلب نہیں نکلتا ہے غور کریں۔

(تشریح ختم۔ منقول از اشکال جواب اشکال۔)	(جاری)

إن الله لطيف خبير
علمی، دینی، اصلاحی اور معلوماتی
اللطیف
ویلور
رات کے وقت دار العلوم لطیفیہ، حضرت مکان ویلور کا حسین منظر
دار العلوم لطیفیہ مکانِ حضرت قطب ویلور